ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مجھے فخر ہے

''میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرہ میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔''

(مولانا ابوالکلام آزادؒ)

مرکز الإمام أبي الحسن الندوي
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

تہذیب مغرب
کی اجزائے ترکیبی

''اس تہذیبی مجموعہ میں ناقص اجزاء بھی تھے اور مکمل بھی، مضر بھی اور مفید بھی، صحیح بھی اور غلط بھی، اس میں علم کے ان بدیہیات کے ساتھ جو ہر شبہہ سے بالاتر ہیں، ایسے غلط قیاسات، خیالات وافکار اور بزعم خود ایسے فیصلے بھی شامل تھے جن میں بحث و مباحثہ اور غور وخوض کی پوری گنجائش موجود ہے، ان میں ایسے علمی نتائج بھی تھے، جو بڑے غور وخوض اور مطالعہ وتجربہ کا نچوڑ تھے اور ایسے بھی تھے جن کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت تھا، وہ اجزاء اور عناصر بھی تھے جو کسی خاص ملک اور قوم کے ساتھ مخصوص نہیں مثلاً تجربی علوم، اور وہ بھی جن میں مغربی تہذیب کی مقامی روح پوری طرح نمایاں تھی، اور مغربی ماحول اور معاشرہ کا ان پر گہرا اثر تھا، اور وہ ان تاریخی انقلابات اور حوادث کا نتیجہ تھے جن سے مغربی اقوام کو اپنے دائرۂ عمل اور مرکز میں گزرنا پڑا، وہ بھی تھے جن کا دین وعقائد سے گہرا تعلق تھا، اور وہ اجزاء بھی تھے جن کو سرے سے مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔''

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

(مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش:۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

مرکز الامام أبی الحسن الندوی
دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)
www.abulhasanalinadwi.org

فہرس

اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ۲
محمد نفیس خاں ندوی
ہدایت ربانی کا تسلسل ۳
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
تیرا کعبہ تیری قسم (نظم) ۴
محترمہ عطیہ خلیل عرب
وحدت اسلامی کی ضرورت ۶
مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی
ملک کی تعمیر یا تخریب ۹
مولانا شمس الحق ندوی
ووٹ - ایک امانت ۱۰
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
خلع کے چند مباحث ۱۲
مفتی راشد حسین ندوی
تنقید جب حد سے گذر جائے ۱۴
جناب ابوہاجر
ذکر الٰہی کی اہمیت ۱۵
عبدالرحمٰن ندوی
عورتوں کا لباس کیسا ہو ۱۶
مفتی محمد احمد علی
نکاح میں مہر کی ضرورت ۱۸
مفتی شعیب احمد بستوی

جلد نمبر/۵ شمارہ نمبر/۱۲

دسمبر ۲۰۱۳ء

سرپرست

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
(صدر، دارعرفات)

نگراں

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ
(جنرل سکریٹری، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی
مفتی راشد حسین ندوی ❁ عبدالسبحان ناخدا ندوی
محمود حسن حسنی ندوی ❁ محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

فی شمارہ ۱۰ روپے — سالانہ: ۱۰۰ روپے

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الإمام أبي الحسن الندوي، دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

Mail: markazulimam@gmail.com

اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش

محمد نفیس خاں ندوی

''آئندہ سو سال میں اگر برطانیہ بلکہ یورپ پر کسی مذہب کی حکمرانی کا امکان پیدا ہوسکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔''
(جارج برناڈ شا- بحوالہ The Genuine, 1936)

یہ تھی مغربی مفکرین کی وہ بصیرت یا اسلامی غلبہ کا وہ خوف جس کا احساس ان کو اس وقت ہو چکا تھا جب تازہ دم مغرب کے سامنے مشرق کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں اور اسلامی حکومتوں کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا، یہ وہی زمانہ ہے جب علامہ اقبالؒ اہل مشرق کو مغربی تہذیب کی ناپائداری سے آگاہ کر رہے تھے، اور مصر میں حسن البناءؒ اہل اسلام کو اسلامی ثقافت کے عروج وزوال کی حقیقت بیان کر رہے تھے۔ دوسری جانب صہیونی آقا دوہری پالیسی میں مصروف تھے، ایک پالیسی دنیا کو سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے ساتھ مختلف گمراہ کن فلسفوں میں الجھانا تھا، اور دوسری پالیسی تہذیبی تصادم کی طرف پیش قدمی تھی، یعنی مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ کے لائق بنانا اور خود اسلامی تہذیب میں شکوک وشبہات پیدا کر کے اسے کھوکھلا بنانے کی کوشش کرنا تاکہ عالم انسانی پر یہودیت کی گرفت مضبوط اور پائیدار ہو سکے۔

اسلامی تہذیب کے خلاف پروپیگنڈوں کا آغاز صلیبی جنگوں میں یورپ کی شکست کے بعد سے ہو چکا تھا لیکن اسلام مخالف اس مہم میں روح پھونکنے اور اسے تازہ دم بنانے میں صہیونی مؤرخ برناڈ لوئس نے اہم کردار ادا کیا، اسلامی اور مغربی تہذیب کے تصادم کی راہ ہموار کرنیکی بھرپور کوشش کی، اور اسلام کا ایسا ''ہوّا'' (Hype) کھڑا کیا جس کے نتیجہ میں مغربی مفکرین بوکھلا اٹھے، اور پھر پوری قوت اور پورے جوش کے ساتھ استشراق (Orientalism) کے عنوان سے اسلام پر تاریخ اور اسلامی علوم وفنون کے ذریعہ دراندازی کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن عالم اسلام اور خاص کر برصغیر سے اس کا بھرپور دفاع کیا گیا، جس سے مغربی حلقہ نے اپنی پالیسی پر نظر ثانی کی اور مسلمانوں کو تاریخی اور علمی سطح کے ساتھ تہذیبی سطح پر بھی نشانہ بنانے کی وضع اختیار کی، چنانچہ اس نظریہ کو کو پوری قوت کے ساتھ نافذ کرنے کی مہم چلائی گئی، اور ساتھ ہی انتہا پسند عیسائیوں کو پرفریب نعرے اور اسلام کے موہوم خطرہ کے نام پر اپنا ہمنوا بنا لیا گیا۔ اور پھر "Clash of Civilization and the Remaking of The World Order" کے نام سے ایک کتاب لکھی گئی جس میں اسلامی تعلیمات پر رکیک اور سخت حملے کیے گئے، اور اسلام کو یورپ کے لیے ایک سنگین خطرہ بتلایا گیا، اس کتاب کی اشاعت وتشہیر میں بھرپور محنت کی گئی۔ اس کے بعد سے اسلامی تہذیب وثقافت اور اسلامی اقدار کو کھل کر نشانہ بنایا جانے لگا، اور پھر یہیں سے اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کا کھل کر آغاز ہو گیا۔

اس کشمکش میں سب سے پہلے اسلامی اقدار پر حملے کیے گئے اور عورتوں کے حقوق، پردہ، ڈاڑھی، جہاد وغیرہ سے ہوتا ہوا معاملہ بتدریج توہین رسالت تک پہنچا، اور پھر آنحضرت ﷺ کی پر فلمیں بنانے اور اور مختلف کارٹون بنانے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، ان ساری خرافات کا مقصد مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا اور اسلامی اقدار اور روایات کو مشکوک کرنا تھا، اور اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ اسلام اور مسلمان عالمی سطح پر قیادت کے اہل نہ بن سکیں..... (باقی آخری صفحہ پر)

ہدایت ربانی کا تسلسل

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

﴿وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ (القصص: ۵۱) (اور ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان لوگوں کے لیے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے بھیجا، تاکہ یہ لوگ (بار بار تازہ بتازہ سننے سے) نصیحت مانیں)۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ﴾ "اور ہم نے ان کے لیے قول کو مسلسل جاری رکھا" یعنی اس کا سلسلہ وقفوں کے ساتھ، یعنی مکانی اور زمانی فرقوں کے ساتھ جاری رہا، اگر دیکھا جائے اور اس میں معنوی اتصال بھی ہے اور کبھی کبھی زمانی اتصال بھی ہے، کبھی کبھی مکانی اتصال بھی ہے اور ایک چیز جو مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات میں پیش کی جائے، اس کے اندر اختلاف وتفاوت اور اس میں بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کو عربی کے وسیع معنی میں اضطراب کہتے ہیں، اس کا اندیشہ ہوتا ہے، لیکن اس میں کتب سماوی کے اتصال معنوی اور اتصال رائی، اتصال مقصدی اور وہ اس میں ہدایت کا ہونا اور اس میں رہنمائی کے سامان کا ہونا، اس میں عقائد صحیحہ کا اس کے ذریعہ سے معلوم ہونا، عقائد صحیحہ کا بھی اور حقائق صحیحہ کا بھی، یہ سب کے لیے ایک لفظ "تَوْصِيل" کا لفظ، (جس کا ترجمہ کسی زبان میں ذرا مشکل ہے) کہ اس میں یہ ایک طرح کا تواتر ہے، ایک تواتر تو ہوتا ہے کہ حدیث کی اصطلاح ہے اور ایک تواتر یہ ہے کہ معنوی تواتر اور مقصدی تواتر، یہ تمام کتب سماویہ میں ہے، ورنہ جب کسی ایک مقصد کے لیے کچھ چیزیں ہوتی ہیں، تو ان میں بہت تفاوت ہوجاتا ہے، بعض مرتبہ تضاد بھی ہوجاتا ہے، لیکن اس تضاد کی بھی نفی ہے اور انتشار کی بھی نفی ہے اور اضطراب کی نفی ہے۔

﴿وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ﴾ (ہم نے ان کے لیے سلسلہ جاری رکھا) اور مسلسل رکھا، وحی الٰہی کا اور ہدایت ربانی کا، ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ (تاکہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں)۔

ہر کتاب سماوی میں یہی ہے، ہر پیغمبر یہی کہتا رہا ہے، ہر پیغمبر نے توحید خالص کی دعوت دی، ہر پیغمبر نے آخرت کو یاد دلایا اور اس کا یقینی ہونا بیان کیا اور ہر پیغمبر نے عدل وظلم کے درمیان فرق کیا، حق و باطل کے درمیان فرق کیا، طاعت ومعصیت کے درمیان فرق کیا، تو جو اصول ہیں، وہ سب کے سب سب میں مشترک ہیں، یہ خود ایک بات اللہ کی، من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل، (اور قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارے آئے ہیں اور تجربہ بھی ہے) کہ انسانی تصنیفات اور انسانی بیانات اور انسانی تحقیقات تک، ان سب میں نہ صرف تفاوت ہوتا ہے، بلکہ اکثر تضاد بھی ہوجاتا ہے اور شاید کوئی علم ایسا ہو، جس میں بالکل کسی قسم کا کوئی تفاوت نہ ہو، تضاد نہ ہو، یہاں تک کہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد تحقیق ہوتی ہے کہ وہ بات صحیح نہیں تھی، یا تھی اور یا جتنی تھی، اتنی صحیح نہیں تھی، اس سے کم یا زیادہ، یا تو مقدار میں فرق ہوجاتا ہے اور یا اس کی نوعیت میں فرق ہوجاتا ہے، حقیقت میں فرق ہوجاتا ہے، یہ فرق جو ہے یہ انسانی اس کو اگر لیڈ یچر کہا جائے، یا فکر انسانی کہا جائے، یا اس کو انسان کی علم کی رسائی کہا جائے، تحقیقات علمی کہا جائے، یہاں تک کہ جو خالص تحقیقات علمی ہے، ان میں بھی اتنا بڑا فرق ہے کہ آدمی کا پھر اعتبار جاتا رہتا ہے، یعنی آدمی اگر صرف اس کو موضوع بنالے کہ محققین کی تحقیقات میں اور مفکرین کے افکار میں اور ادباء کی تحریروں میں اور شعراء کی شاعری میں کتنا تفاوت ہے، زمان ومکان کے اختلاف کے ساتھ، بلکہ بعض مرتبہ ایک ہی زمانہ میں اور ایک ہی ملک میں، مکان سے مراد یہ نہیں کہ کوئی محلہ ہو، ایک ہی ملک میں، ایک ہی شہر میں، اتنا تفاوت ہوتا ہے، ہمارا پورا انسانی لٹریچر تفاوت سے، بلکہ تضاد سے بھرا ہوا ہے اور خود سائنس کی جتنی ترقی ہوئی، اس نے ثابت کیا کہ اس سے پہلے کے کتنے نظریات غلط تھے، ہم نے

جیسے آپ کو بتایا کہ منطق قیاسی جو ساری دنیا میں رائج تھی، وہ بالکل کمزور ہے اور اس سے ہم صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتے، پھر منطق استقرائی آئی، اس کے متعلق یہ تسلیم ہے، مغربی محققین کو بھی ''گستاؤلبان''(Gustav Lebon) اس میں پیش پیش ہے کہ وہ اندلس سے آئی ہے اور اس میں اسلامی فیض بھی شامل ہوگیا کہ اندلس سے جو چیز آئے گی، وہ اسلامی فیض سے خالی نہیں ہوسکتی، ضرور اس میں قرآن مجید سے کوئی رہنمائی حاصل کی گئی، یا پھر اللہ کی طرف سے مدد ہوئی اور اس کو الہام بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کو توفیق بھی کہہ سکتے ہیں۔

تو قرآن مجید کا یہ ایک اشارہ ہے، یہ چند لفظ ہیں، ﴿وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ یہ صرف اسی بات پر موقوف نہیں ہے، محدود نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آئی، اس میں اتفاق بھی تھا، تسلسل بھی تھا اور توافق بھی تھا، بلکہ اگر آدمی اس کو سامنے رکھ کر کے مقابلہ کرے، ''وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ'' اضداد سے پھر قدر آتی ہے، جب اضداد دیکھئے، جب اس کے اضداد انسانی لیٹریچر میں اور فکر میں دیکھے گا، تب اس کی قدر آئے گی، ﴿لَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ اور یہ صحف سماوی اگر یہ تحریف سے خالی ہوتے تو آپ دیکھتے کہ زمانوں کے فرق کے ساتھ، صدیوں کے نہیں اور بعض مرتبہ ایک ہزار، یا اس کے کم یا زائد کا فرق ہو، ان صحف میں ایک ہی بات پیش ہونا، ایک ہی چیز کی طرف دعوت دینا، زمانے کے فرق کے ساتھ اور مکان کے فرق کے ساتھ، جغرافیائی فرق کے ساتھ، تاریخی فرق کے ساتھ، اذہان انسانی کے فرق کے ساتھ، رغبات انسانی کے فرق کے ساتھ اور اقتناع جسے کہتے ہیں عربی میں اقتناع کی صلاحیت، اس کے فرق کے ساتھ ایک ہی بات کہی، اللہ کے ذات وصفات کو ہر صحیفے میں، ہر پیغمبر نے، خواہ اس کا زمانہ کوئی ہو، اس کا ماحول کوئی ہو، اس کا پس منظر کوئی ہو، اس میں جو بات کہی، یہ تنہا صداقت کے لیے کافی ہے حالانکہ کوئی مشورہ نہیں، مشورہ کا کوئی امکان ہی نہیں تھا، زمانہ کا فرق، مقامات کا فرق، تو یہ گویا اعجاز کی ایک دلیل ہے۔

تیرا کعبہ تیری قسم

محترمہ عطیہ خلیل عرب

آنکھوں میں آگیا تیرا کعبہ تیری قسم
دل میں سما گیا تیرا کعبہ تیری قسم

پلکوں سے چومتے ہیں تیرے آستاں کو ہم
نزدیک آگیا تیرا کعبہ تیری قسم

دیوانہ وار رقص کیا ہے مطاف پر
ہر سمت چھا گیا تیرا کعبہ تیری قسم

لبیک کی صداؤں سے گونجا حرم تمام
دل کو جگا گیا تیرا کعبہ تیری قسم

ہمراہ چل رہے تھے فرشتے طواف میں
رحمت لٹا گیا تیرا کعبہ تیری قسم

سرشار ہو گئے مئے توحید سے ہمیں
بے خود بنا گیا تیرا کعبہ تیری قسم

صحن حرم، جبین نیاز اور حطیم پاک
رتبہ بڑھا گیا تیرا کعبہ تیری قسم

زم زم کی بوند بوند شفا اور علم ہے
جینا سکھا گیا تیرا کعبہ تیری قسم

گھبرا گئے ہیں جب بھی ہجوم بلا سے ہم
ہم کو بچا گیا تیرا کعبہ تیری قسم

رب کریم! تیری عنایت پہ ہم نثار
بگڑی بنا گیا تیرا کعبہ تیری قسم

محبت اللہ کے لیے ہو

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

محبت ونفرت میں انصاف اور حقیقت پسندی کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں عام طور پر آدمی کسی کے چہرے کی خوبصورتی یا اس کے انداز کی دلکشی سے متاثر ہوکر اس کی ہر بات کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، اور کسی کی بے توجہی یا درشت کلامی یا بلا ارادہ یا باارادہ ناانصافی سے ناراض ہوکر اس کے خلاف دل میں پہاڑ کھڑے کرلیتا ہے اور پھر یہ کسی چھوٹی اور معمولی چیز سے پیدا ہونے والی دل بستگی کبھی سادہ محبت سے عشق تک پہنچادیتی ہے، ایسا عموماً جذباتی بے اعتدالی اور ذہنی بے انصافی کی صورت میں ہوجایا کرتا ہے، اور بسا اوقات اس میں سمجھ دار لوگ مبتلا ہوجایا کرتے ہیں، اور پھر بات بڑی ہوجاتی ہے، اور سخت نقصان بھی پہنچادیتی ہے، اور زیادہ مذموم اس وقت سے ہوجاتی ہے جب محبت ایسے سے ہوجائے جو محبت کے قابل نہیں اور نفرت ایسے سے ہوجائے جو نفرت کجا، قدردانی ومحبت کا مستحق ہو۔

یہ اگر صرف دنیا تک محدود ہو تو اس کا محبت ونفرت میں اس طرح کی بے اعتدالی کا اثر صرف اس محدود زندگی تک ہی رہتا ہے، لیکن اگر مسئلہ دین کا آجائے تو اس کا اثر آخرت پر بھی پڑتا ہے، چنانچہ حضور ﷺ نے ایک صحابی کے سوال کے جواب میں فرمایا: "المرء مع من أحب" یعنی آدمی کو اس کا ساتھ حاصل ہوگا جس سے اس کو محبت ہے، دنیا میں کسی کے ساتھ ہونا ایک محدود وقت تک کا مسئلہ ہے جو کوئی سنگین مسئلہ نہیں، لیکن آخرت میں کسی کے ساتھ ہونا بہت اہم مسئلہ ہے، یا تو وہ رحمت ہی رحمت ہے، اور یا پھر زحمت ہی زحمت ہے، جن حضرات کو آخرت پر یقین ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آنکھ بند ہوتے ہی ان کو زندگی کے نئے دور اور ایک ایسے نظام میں داخل ہونا ہے جو لامتناہی نظام ہوگا، ان کے لیے یہ مسئلہ بہت سوچنے کا اور بہت غور کرنے کا ہے کہ ان کا آخرت میں کن کا ساتھ ہوگا۔

افسوس ہے کہ محبت ونفرت کے معاملہ میں ہم عموماً بے خیالی میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں اور بہت کم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم اپنا دل کس کس کے حوالے کرتے رہتے ہیں، حتی کہ ہم دشمن خدا سے بھی اپنا دل لگا لیتے ہیں اور محبت کرنے لگتے ہیں، کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ دوسرے عالم میں جہاں صرف خدا سے واسطہ ہوگا اور اس کی طرف سے جزا اور سزا اور محاسبہ ہوگا اس کے دشمن کا ہمارا ساتھ ہو جب کہ اللہ تعالی کو اپنے دشمن کے معاملہ میں اتنی غیرت ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کافر کی جب مدح کی جاتی ہے تو عرش الٰہی ہلنے لگتا ہے، اس لیے دل لگانے میں کافر ومومن کا فرق ناروا روی کی بات نہیں ہے، اور جب ماحول ایسا ہو کہ گمراہ اشخاص اور دشمنان خدا لوگوں کو دنیاوی کشش اور جاذبیت کے وسائل حاصل ہوں تو مسئلہ بڑا نازک اور خطرناک ہوجاتا ہے، چنانچہ کافر کی دنیاوی کشش وجاذبیت مسلمانوں کے لیے ایک طرح کا بڑا فتنہ اور بڑی آزمائش کا مقام ہے، یہ کوئی آزادانہ چہل قدمی کا مقام نہیں ہے، آنکھوں کا لطف ہو یا کانوں کی لذت یا نفس کا سرور ان میں کوئی چیز جہنم میں گرنے والے کی رفاقت کی سزا کا بدل نہیں ہوسکتی ہم بعض اوقات سیاسی ہم مذاقی یا معاشی منفعت اور جاہ کے حصول کی راہ میں اس طرح کی منزل سے بآسانی گزر جاتے ہیں اور دل فریب چیز کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے اس سطحی اور ظاہری خوبی کے پیچھے کیا وہ طویل قامت یا حسین شخصیت موجود ہے جو اس کے اور اس کے محبت کرنے والے کو آخرت میں شرمندہ اور مصیبت زدہ نہ بنائے، اور جس سے الفت ومحبت اس طویل اور لامتناہی زندگی میں آفت جان نہ بن جائے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ﴾ ﴿وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ﴾ کہ غلام جو ایمان والا ہو وہ مشرک سے بہتر ہے خواہ مشرک تم کو پسند آگیا ہو، اور لونڈی جو ایمان والی ہو مشرکہ سے بہتر ہے خواہ مشرکہ تم کو پسند آگئی ہو۔

دل دینے میں یا محبت کرنے میں ہم کو ضرور یہ دیکھنا چاہئے کہ مذہبی رخ سے یہ بات ہمارے لیے کوئی ضرر تو نہیں رکھتی! ہم بآسانی دشمن خدا کو اس کی ظاہری خوش اخلاقی کی بنا پر اور دشمن دین کو اس کے دل کش چہرے کی بنا پر اپنے دل میں اتار لیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ تعلق آخرت میں رفاقت کا باعث بن سکتا ہے، جہاں اہل جنت کی رفاقت کے سوا کوئی دوسری رفاقت قابل برداشت نہیں۔

وحدت اسلام کی ضرورت

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی

مسلمانوں کو تاریخ کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑا ہے، کبھی غلبہ، حکمرانی، اقتدار اور شوکت تو کبھی ہزیمت، پسپائی اور شکست، حالات بدلتے رہے، تاریخ اپنے پرت ان پر کھولتی گئی، امت اسلامیہ پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کی سلامتی اور بقاء پر خطرات کے بادل منڈلانے لگے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کا عقیدہ توحید بھی متزلزل ہونے لگا، خطرہ اس بات کا نہیں تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے زمام اقتدار چھوٹ جائے گی، خطرہ اس بات کا تھا کہ وقت کی اس تیز تند آندھی میں ان کی دینی شناخت باقی رہ پائے گی یا نہیں، یہ حالات علاقائی بھی تھے اور بسا اوقات عالمگیر بھی، اور کبھی تاریخ نے مسلمانوں کو ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھرتے ہوئے دیکھا یا جس وقت دنیا پر ان کی حکمرانی کا جھنڈا لہرا رہا تھا، اور وہ اپنے قوانین لاگو کر رہے تھے، اپنی دینی تعلیم عام کر رہے تھے، اپنا کلچر رائج کر رہے تھے، وہ جس ملک کو فتح کرتے تھے اس ملک کی زبان کو اپنا وسیلہ بنا لیتے تھے، جب انہوں نے یورپ پر فتح حاصل کی اور اسپین پر اپنا جھنڈا لہرایا تو وہاں کی قومی زبان (National language) عربی قرار پائی، یہاں تک کہ ایک مسیحی کاہن کو اس کا احساس ہوا، اور اس نے اپنے اس احساس کا اظہار بھی کیا، ڈاکٹر احمد حسن زیات اپنی کتاب ''تاریخ الأدب العربی'' میں لکھتے ہیں، اسپین کے باشندوں نے نہ صرف یہ کہ عرب کلچر (Culture) کو قبول (Adopt) کرلیا، ان کے دین میں داخل ہوگئے، یہاں تک کہ ان کی زبان کو بھی اپنالیا، ان کے اسلامی اخلاق سے آراستہ ہوگئے، اور اپنی ملکی قدروں کو یکسر بھلادیا، اور اس سے بالکل لا تعلق ہوگئے، ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک مسیحی کاہن کی زبان پر شکوہ آہی گیا، لیکن یہ پادری بھی عربی زبان کے اس تیز دھارے سے اپنے کو بچا نہیں سکے، اور اپنے مذہبی سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کرنے پر مجبور ہوگئے۔

اسی طرح ان تمام ممالک کو لے لیجیے، جہاں جہاں اسلامی پرچم لہرایا، وہاں کے باشندوں نے فاتح مسلم قوم کی زبان اور کلچر کو قبول کرلیا، اور ان کے دین میں بغیر کسی زور زبردستی یا سختی کے داخل ہوگئے، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، مسلمانوں کا حال تو یہ تھا کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ کرتے تھے، ان کو مکمل آزادی دے دی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعلیمات اس کی روشن دلیل ہیں کہ جب انہوں نے بیت المقدس کو فتح کیا اور وہاں کے باشندوں کے لیے صلح نامہ لکھا تو اس میں یہ لکھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وہ امان ہے جو اللہ کے غلام امیر المؤمنین عمر نے ایلیا کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست اور بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے اس طرح کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ ان کو اور نہ ان کے احاطہ کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہیں کیا جائے گا، نہ ان میں کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا، ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں، ایلیا والوں پر یہ فرض ہے کہ او رشہروں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں اور چوروں کو نکال دیں، ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اس کی جان اور مال کو امن ہے تا آنکہ وہ جائے پناہ میں پہنچ جائے اور جو ایلیا ہی رہنا اختیار

کرلے تو اس کو بھی امن ہے اور اس کو جزیہ دینا ہوگا اور ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان اور مال لے کر یونانیوں کے ساتھ چلا جانا چاہے تو ان کو اور ان کے گرجاؤں کو اور صلیبوں کو امن ہے یہاں تک کہ وہ اپنی جائے پناہ پہنچ جائیں اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر اللہ کا، رسول خدا کا، خلفاء کا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے بشرطیکہ یہ لوگ جزیہ مقررہ ادا کرتے رہیں اس تحریر پر گواہ ہیں خالد بن الولید اور عمرو بن العاص اور عبد الرحمٰن بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم اس فرمان میں صاف تصریح ہے کہ عیسائیوں کی جان، مال اور مذہب ہر طرح سے محفوظ رہے گا اور یہ ظاہر ہے کہ کسی قوم کو جس قدر حقوق حاصل ہوسکتے ہیں انہی تین چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں۔"

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کو اعلیٰ اسلامی اخلاق کا حامل سمجھا جاتا ہے، کرم گستری، رحمدلی، عدل وانصاف پروری، رعایا کا خیال رکھنا، ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنا اور ان کے غموں کو اپنے دل پر محسوس کرنا، یہ وہ اوصاف ہیں جو سلطان میں نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے تھے، ایک عیسائی مؤرخ لین لبون بیت المقدس کی فتح کے دن سلطان کی ان نمایاں صفات کی یوں منظر کشی کرتا ہے۔

سلطان کی کرم گستری، عالی ہمتی اور شریفانہ طبیعت کے پرت تو حقیقت میں اس دن کھلے، جس دن مسلمانوں کو بیت المقدس کی چابیاں ملیں، اور ان کی فوج اور گورنر وہاں فاتحانہ داخل ہوئے، ایک بھی عیسائی ایسا نہ تھا جس کو مسلمانوں کی جانب سے سختی کا سامنا کرنا پڑا ہو، بادشاہ کے پہریدار ملک کی باہر کی سڑکوں پر اور سرحدوں پر پہریداری کرتے تھے، اور باب داؤد پر ایک امانتدار ٹیکس وصول کرنے والا تعینات تھا، جو ہر فدیہ دینے والے کو باہر جانے کی اجازت دے دیتا تھا، مورخ لین لبون اس کے بعد تحریر کرتے ہیں، اس انصاف پرور بادشاہ کے بھائی اور اس کے درباریوں کا حال یہ تھا کہ انہوں نے ہزاروں غلاموں کو آزادی کا پروانہ عطا کیا، پھر صلاح الدین ایوبی نے اپنے ماتحت افسر سے کہا، اے میرے بھائی تم بھی صدقہ کرو اور تمام درباریوں کو صدقہ کی ترغیب دو، اور میں بھی صدقہ کرنا چاہتا ہوں، پھر انہوں نے ایک فوجی کو یہ حکم دیا کہ وہ تمام راستوں، گلیوں میں یہ صدا لگادے کہ وہ تمام عمر دراز اور بچے جو فدیہ دینے کی پوزیشن (Position) میں نہیں وہ بھی آزاد ہیں، جہاں چاہیں جاسکتے ہیں، تو وہ سب وہاں سے نکلنے لگے یہاں تک کہ یہ سلسلہ طلوع شمس سے غروب آفتاب تک جاری رہا، اور اس کے علاوہ صلاح الدین ایوبیؒ نے لاچاروں اور مسکینوں پر جو خرچ کیا، اس کا تو اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔

مسلمان فاتحین کا ہمیشہ یہ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنے اخلاق سے دل جیتتے تھے، ہندوستان نے بھی اس کا مشاہدہ کیا ہے، یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیر جس کو متعصب انگریز مؤرخوں نے ڈکٹیٹر کے نام سے یاد کیا ہے اور اس پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے کہ اس نے غیر مسلموں کو نہایت ہی بے رحمی سے قتل کیا ہے، ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کردیا ہے، حالانکہ صورتحال اس کے بالکل برعکس تھی۔

اور اگر ان کے والد شاہ جہاں کی بات کی جائے تو وہ عفو ودرگزر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، اور جہاں گیر کا انصاف تو ضرب المثل بن گیا، یہاں تک یہ لفظ ان کے نام کا جزء لاینفک ہوگیا، اور انگریز منصف مؤرخوں نے اس حقیقت کو کھلے ذہن سے قبول بھی کیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسلام بہت تیزی سے پھیلا، اور اسلام پسندوں کے اقلیت میں ہونے کے باوجود چند سالوں میں دنیا کا نقشہ بدل گیا، اور متعدد غیر اسلامی ممالک عالم اسلامی کے نام سے جانے جانے لگے، وہاں کی زبان عربی زبان ہوگئی، بعض ممالک نے اپنی تہذیب اور زبان کو قیمتی سرمایہ کی طرح محفوظ رکھا، انہی ممالک میں ایک ملک ہندوستان بھی ہے، یہاں مسلم حکمرانوں کی حکومت آٹھ صدیوں پر محیط رہی، ان کے تعلقات غیر مسلموں سے بھی رہے، غیر مسلم حکومت کا ایک حصہ بھی رہے، ان مسلم حکمرانوں نے ان کے مذہبی امور میں مداخلت بھی نہیں کی

ہندوستان میں اسلام داعیوں اور مصلحین کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جنہوں نے صرف اللہ کے لیے خاموشی کے ساتھ اپنا کام

کیا، ان کو حکومتوں کی مدد حاصل نہیں تھی، اور اس کا اعتراف مستشرق آرنلڈ نے اپنی کتاب الدعوۃ الی الاسلام میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ اسلام ہندوستان میں داعیوں اور مصلحین کی محنتوں کا ثمرہ ہے، اور اسی کے ضمن میں انہوں نے تاتاریوں کے قبول اسلام کا قصہ بھی ذکر کیا۔

اسلام کی دعوت تمام اسلامی تحریکات کے لیے ایک غذا کی حیثیت رکھتی ہے، یہی امت اسلامیہ کا شعار ہے، اور یہی خصوصیت اس کی بقاء کی ضامن ہے، اللہ رب العزت فرماتا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

مسلمانوں کا دوسرا نمایاں وصف وحدت اور یکجہتی ہے، ان کے اور ان کے حکمرانوں کے درمیان باہم ربط وتعلق ہے، مسلم حکمرانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعایا کا خیال رکھیں، ان کی ضرورتوں کی تکمیل کریں، علماء اور صلحاء کی توقیر کریں، اور کبھی کبھی نصیحت کے لیے ان کو دعوت دیں۔

یہ وحدت اور یکجہتی ایک عالمی امت کا شعار ہے، اور اسی وصف سے متصف ہوکر انہوں نے اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کی، اور مختلف غزوات اور جنگوں میں اسلامی پرچم لہرایا، اور خاص طور پر صلیبی جنگوں میں وہ ہمیشہ حاوی رہے، اس کا بھی اعتراف بہت سے حقیقت پسند مورخوں نے کیا ہے کہ مسلمان جب جب شیرازہ بندی کا شکار ہوئے، اور ان پر کسی نے حملہ کیا تو وہ سب متحد اور یک مشت ہوگئے، اور ان کی یہی وحدت صلیبیوں کی شکست کا سبب بنی۔

دشمنوں نے آخر اس راز کو پا ہی لیا کہ مسلمانوں کو منتشر کیے بغیر ان پر غلبہ حاصل نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ وہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو (Divide & Rule) پر عمل کرنے لگے، اور اسی کی مدد سے انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت کی، انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف برانگیختہ کیا، دلوں میں دوریاں پیدا کیں، لیکن وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوسکے، وحدت اور یکجہتی آزادی کے پرچم تلے پھر ابھر آئی، اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا، اور خلافت عثمانیہ کے سقوط کا راز بھی اس میں پنہاں ہے کہ حکومت انتشار کے ساتھ نہیں چل سکتی۔

یورپ عالم اسلام پر تقریبا ایک صدی تک حاوی رہا، پھر اس کو وہاں سے نکلنا پڑا، کیوں کہ قومی اور دینی شعور مسلمانوں میں بیدار ہوچکا تھا، وہ اس وقت ان ممالک میں داخل ہوئے تھے جب مسلمان بٹے ہوئے تھے، ان میں دنیا کی محبت سرایت کرگئی تھی، ان کا خوف دوسروں کے دلوں سے نکل چکا تھا، رعایا حکمرانوں کے خلاف برسرپیکار تھی، اور مسلمان مختلف دینی تہذیبی اور فکری کیمپوں میں تقسیم ہوچکے تھے، وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے۔

آج جو صورتحال ہے وہ اس صورتحال سے مختلف نہیں جو سامراجی نظام سے قبل رائج تھی، چاہے بات مصر کی ہو یا شام کی، یا عراق کی، ہر جگہ جنگ برپا ہے، وہاں کے باشندے اپنے ہاتھوں امن کو تار تار کررہے ہیں، اپنے ملک کا حسن بگاڑ رہے ہیں، مسلمان آپس میں خونریزی کا کھیل کھیل رہے ہیں، اور ان کو اس کا احساس بھی نہیں کہ انسانی جان کی کتنی اہمیت ہے۔

امریکی نیوز ایجنسی این بی سی کے حوالہ سے معلوم ہوا کہ وہ واقعات جو اسلامی ممالک میں ان تیس سالوں میں پیش آئے، اس کا لقمہ چار ملین مسلمان بنے، اور یہ صورتحال ہر اس شخص پر عیاں ہے جو ٹیلیویزن دیکھتا ہے، اخبارات پڑھتا ہے، یا کسی حد تک نیوز سن لیتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومتیں ان اسلامی ممالک میں فکری اور سیاسی طور سے وہاں کے مسائل کا تصفیہ کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئیں، اور خونریزی روکنے میں ناکام رہیں، انہوں نے باہر والوں کے لیے راستہ ہموار کیا، وہ ایک بڑے خطرہ سے ڈراتی رہیں، اور وہ خطرہ ہے سامراجی نظام حکومت کا، جو آج ان اسلامی ممالک پر منڈلا رہا ہے۔

(ترجمانی: خلیل حسنی ندوی)

ملک کی تعمیر یا تخریب

مولانا شمس الحق ندوی

اس وقت ہمارا ملک جس لاقانونیت اور انارکی کا شکار ہے شاید کبھی ایسا رہا ہو، قتل وخونریزی تو اب معمولات زندگی میں شامل ہوگئی ہے، کبھی اونچی ذات والے نیچی ذات والوں کو جلاتے مارتے ہیں اور پھر یہ نیچی ذات والے بھی جب عاجز آجاتے ہیں تو آخر انتقام پر اتر آتے ہیں اور اس بری طرح بدلہ لیتے ہیں کہ انسانیت کانپ اٹھتی ہے، کبھی اکثریت اقلیت کو جلاتی مارتی ہے اور کبھی بہت چھوٹی سی اقلیت بہت بڑی اکثریت کو نہایت بے دردی کے ساتھ گولیوں سے بھون کر رکھ دیتی ہے، جہیز کی بھینٹ چڑھنے والی عورتوں، لٹیروں، اچکوں اور معمولی جھگڑوں اور اختلافات پر قتل وخونریزی کے واقعات الگ ہیں۔

علاقائی، لسانی اور قومی تعصب کی بنیاد پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اسٹرائکوں اور آئے دن بند منانے جلوس نکالنے کا ایک لامتناہی سلسلہ الگ جاری ہے اس میں ملک کی کتنی توانائی صرف ہو رہی کتنا نقصان ہو رہا ہے اس کا حساب لگانا آسان نہیں وہ ملک جس میں غریبی ہٹاؤ کا نعرہ دیا جا رہا ہو جس میں بے روزگاری عام ہو لاکھوں کی تعداد میں لوگ جھوپڑیوں میں رہتے ہوں، وہ ملک جس میں بے رحمی وبربریت اس درجہ کو پہنچ گئی ہو کہ ڈاکٹروں کا طبقہ جس کو رحم دلی اور انسانی ہمدردی کا سبق پڑھایا جاتا ہے وہ مریضوں کو تڑپتا دیکھتا ہو اور طبی امداد بہم پہنچانے سے انکار کرتا ہو، چند ٹکوں کی خاطر قیمتی جانوں کی پرواہ نہ کرتا ہو، اس ملک کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، ایک طرف تو ہمارے ملک کے یہ خطرناک، نہایت مہیب اور دل دہلا دینے والے حالات ہیں جو بلا کسی ادنیٰ تاخیر کے اس بات کے متقاضی ہیں کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھایا جائے جس کے اندر جتنی قوت وصلاحیت ہو آگ بجھانے میں لگا دے، دوسری طرف ہمارے ارباب حکومت کا یہ حال ہے کہ نصاب تعلیم میں وہ زہر گھول رہے ہیں جو پانی کے بجائے تیل کا کام کرے۔

اس کو بھولا پن اور سادگی سے تعبیر کیا جائے یا بے مائیگی اور کوتاہ نظری کا نام دیا جائے کہ ایک طرف تو ملک میں آگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں دوسری طرف حال یہ ہے کہ حالات سنبھالنے اور کنٹرول کی فکر کرنے کے بجائے ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں کہ بے چینی بڑھے کچھ لوگ جو آگ بجھانے میں حصہ لے سکتے ہوں کوئی مثبت کردار ادا کر سکتے ہوں اپنے مفاد پر ملک وقوم کے مفاد کو ترجیح دے سکتے ہوں، ملک کے لیے مفید وکارآمد ہو سکتے ہوں، ان کو ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے جو ان کو اس کا موقع نہ دیں، کبھی مسلم پرسنلاء کا مسئلہ کھڑا کر دیا جاتا ہے اس میں بے شمار دولت، وقت اور توانائی ضائع کی جاتی ہے اس سے فرصت نہیں ملنے پاتی کہ یکساں سول کوڈ کی آواز اٹھا دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے فرقہ پرستی ختم ہو جائے گی تفریق ختم ہو جائے گی قانونی طور پر اس کا جواز ہے یا نہیں، ہم اس بحث میں نہیں پڑتے اس لیے کہ ملک کے اخبارات ورسائل نے اس پر بھرپور بحث کی ہے اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات سے بھی آگاہ کیا ہے۔

ہم تو ایک موٹی سی بات کہنا یا پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب ملک اتنے مسائل اور ایسے نازک حالات میں گھرا ہوا ہو جن کا اوپر ذکر ہوا تو ان مسائل کو حل کرنے اور حالات کو سنبھالنے کے بجائے نئے مسائل پیدا کرنا اور اہل ملک کی ایک بڑی اور باصلاحیت تعداد کو غیر مطمئن کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ کیا ہمارا ملک قحط الرجالی کا ایسا شکار ہو گیا کہ دو چار افراد بھی ایسے نہیں جو بند آنکھوں کو کھول سکیں اور بتا سکیں کہ حالات کا تقاضا اور مطالبہ کیا ہے؟ ملک کو اس وقت انسانیت دوست، محب وطن، اور انسانوں سے پیار کرنے والے حکام کی ضرورت ہے پیدا شدہ مسائل سے ذہنوں کو ہٹانے کے لیے مزید نئے مسائل پیدا کرنا ملک کے ساتھ وفاداری ہے یا غداری؟ ملک کی تعمیر ہے یا تخریب؟ وہ تعمیری منصوبے ہم کو کیا دیں گے جن سے تخریب ہوتی ہو، نتائج وعواقب پر غور وفکر کئے بغیر، گہرائی میں جائے بغیر کوئی نیا فارمولہ پیش کر دینا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مصر رہنا ملک کے لیے مہلک وتباہ کن ہے، ہم کو ہر قسم کے تعصب وانانیت سے دور رہ کر ملک کے مفاد اور مستقبل پر غور کرنا اور اس کی فکر کرنا چاہئے کہ یہی اس وقت کا حقیقی مسئلہ ہے۔

ووٹ-ایک امانت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اس لیے آزادی اس کی فطرت میں ہے، غلامی اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے، خواہ اس غلامی کے ساتھ اس کی جسمانی راحت کا کتنا بھی سرو سامان کیا جائے، ٹھیک ایسے ہی جیسے کسی پرندے کو سونے کے قفس میں بند کر دیا جائے، اس آزادی کے لیے ہمارے بزرگوں نے جہاد کیا اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا، آج ہمارا ملک آزاد ہے، ہم خود اس کے دروبست کے مالک ہیں اور اس کی تقدیر کے فیصلہ میں شریک ہیں یہ آزادی اللہ کی نعمت ہے ہم آزادانہ اپنے افکار وخیالات کا اظہار کر سکتے ہیں، ہم جس بات کو غلط سمجھیں اس کو برملا غلط کہہ سکتے ہیں ہم ان لوگوں کا احتساب کر سکتے ہیں جو اقتدار کے ایوانوں پر متمکن ہیں ہم اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے ہیں اور محرومان ہدایت کو سچائی کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔

اس جمہوریت کا ایک حصہ ''الیکشن'' ہے جس میں ملک کی عوام اپنے لیے اپنی پسند کے نمائندہ منتخب کرتے ہیں، جو ایوان اقتدار میں ان کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں اور ملک کے سیاہ سپید کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں، بنیادی طور پر تو اسلام ''الیکشن'' میں امیدواری ہی کا قائل نہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی عہدہ اور ذمہ داری کا طلب گار ہوگا میں اسے وہ ذمہ داری حوالہ نہ کروں گا'' اس لیے لوگوں سے ووٹ کی بھیک مانگنا اور خواہش کرنا کہ ہمیں اس ذمہ داری کے لیے منتخب کرو، بجائے خود ایک غیر اسلامی بلکہ غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ طریقہ ہے ہونا یہ چاہیے کہ خود لوگ اس سے خواستگار ہوں کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرے، لیکن مشکل یہ ہے کہ مغربی جمہوریت میں ہر چیز کی گنجائش ہے سوائے اخلاق کے، اس لیے خود امیدوار بننے کے سوا چارہ نہیں، ورنہ سارے ہی خراب لوگ سیاست کی اس ریل میں سوار ہو جائیں گے۔

جمہوریت میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہیں بعض خامیاں بھی ہیں، اسلام ان خامیوں کی اصلاح کے ساتھ ان کو قبول کرتا ہے سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں انتخاب میں حصہ لینے اور عوامی نمائندہ منتخب ہونے کے لیے نہ علم ودانش کی شرط ہے، نہ اخلاق ودیانت کی ضرورت، پہلے لوگ اس کا رونا روتے تھے، کہ جاہل اور کم تعلیم یافتہ افراد منتخب ہو جاتے ہیں اور ملک کے حساس مسائل کا فیصلہ ایسے کندہ ناتراش افراد کے حوالے ہوتا ہے، ہمارے ملک میں بعض ایسے ارکان مقننہ بھی تھے اور ہیں جو دستخط کی صلاحیت سے بھی بے نیاز ہیں اور نشان ابہام ہی سے کام چلاتے ہیں، اب بات اس سے بھی آگے جا چکی ہے، اور بڑی تعداد میں ایسے عناصر مجالس قانون ساز میں پہنچ رہے ہیں جو نامزد اور نامور مجرم ہیں ان پر قتل زنا غصب اور رہزنی کے علانیہ جرائم ہیں، پہلے پولیس گرفتار کرنے کے لیے ان کا پیچھا کرتی تھی اب ان کی حفاظت وسلامتی کے لیے ان کے پیچھے پیچھے رہتی ہے، کرپشن اور سیاست کا اب چولی دامن کا رشتہ ہے، اور اب کسی بھی لیڈر کے بارے میں اس کام کی خبریں سن کر عام شہری کو کوئی حیرت نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ اب ایک معمولی بات ہے۔

جو لوگ الیکشن میں کھڑے ہوتے ہیں ان میں شاید ایک فیصد بھی ایسے نہیں جو حقیقت میں ایماندار کہلانے کے لائق ہوں جن کی زندگی پاک وصاف ہو اور عوام کی املاک میں خرد برد کرنے کا عزم لے کر اس میدان میں نہ اترے ہوں، ڈاکٹر راجیندر پرشاد بارہ سال ہندوستان کے صدر رہے اور جب سبک دوش ہو کر اپنے وطن پٹنا گئے، تو ان کو رہنے کے لیے کوئی مکان بھی میسر نہیں تھا، جواہر لال نہرو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رکن تھے، اسوقت فیس رکنیت ۵۰۰ روپے تھی جب مولانا مسعود علی ندوی نہرو جی سے ممبری فیس لینے

گئے تو ان کے پاس پانچ سو روپے بھی مکمل نہ ہو سکے اور دو قسطوں میں فیس ادا کی، اور اپنی پاس بک دکھائی جس میں دو ڈھائی سو روپئے سے زیادہ نہ تھے، لیکن آج معمولی عوامی نمائندوں کے محلات پر قصر شاہی اور گھر کی زیبائش وآرائش پر جنت شداد ہونے کا گمان ہوتا ہے اور پولیس چھاپہ مارتی ہے تو منوں سونے کے زیورات ان کے مکان سے برآمد ہوتے ہیں۔

ان حالات میں ووٹ دینا اور اپنے حق رائے دہی سے استفادہ کرنا جہاں قومی فریضہ ہے وہیں مسلمانوں کے لیے مذہبی فریضہ بھی ہے، تاکہ ایسے نمائندہ کا انتخاب ہو سکے جو نسبتاً صالح کردار، اور اخلاقی اقدار کے حامل ہوں جو مجرمانہ سیاست پر یقین نہ رکھتے ہوں، اور ملک کے سیکولر کردار کی بابت مخلص ہوں، وہ چڑھتے سورج کے پرستار نہ ہوں بلکہ حق اور سچائی کے طرف دار ہوں، موجودہ حالات میں مکمل ایماندار اور پاک وصاف کردار کے حامل سیاسی لیڈر کی تلاش جوئے شیر لانے سے کم نہیں، شریعت کا اصول ہے کہ جہاں بہتر میسر نہ ہو وہاں نسبتاً کم خراب کو اختیار کیا جائے، اس لیے موجودہ حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے ایسے امیدوار کو ووٹ دیا جائے جو ملک مختلف اکائیوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہو، فرقہ پرست نہ ہو، اور نسبتاً صالح کردار کا حامل ہو، وہ کم از کم دو شر میں کم تر درجہ کا شر ہو۔

ووٹ کی حیثیت دراصل شہادت اور گواہی کی ہے، آپ جب کسی امیدوار کے حق میں ووٹ دیتے ہیں تو گویا آپ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تمام امیدواروں میں یہی شخص آپ کے نزدیک اپنی دیانت وامانت جذبہ خدمت اور نمائندگی کی صلاحیت میں نسبتاً بہتر اور قوم وملک کے لیے مفید ہے، کسی شخص کی دیانت اور امانت کے بارے میں آپ کو اطمنان نہ ہو آپ کے علم میں ہو کہ یہ کرپٹ اور راشی ہے اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنے اور اپنے خاندان کی خدمت ہی اس کا مقصود ہے اس کے باوجود آپ اسے ووٹ دیں یا لوگوں کو اس کی ترغیب دیں تو اللہ کے یہاں آپ اس بارے میں جواب دہ ہوں گے اس میں جھوٹی گواہی دینے کا گناہ ہوگا یوں تو ہر جھوٹ برائی ہے لیکن جھوٹی گواہی کا گناہ تمام صورتوں سے بڑھ کر ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے بہت بڑے گناہوں میں ایک شمار فرمایا ہے۔

ووٹ میں امیدوار کی صلاحیت اور کردار کی بجائے محض اس بات کو معیار بنانا کہ یہ ہمارے محلّہ کا ہے، ہمارے اس شخص سے تعلقات ہیں، اس نے ہمارا فلاں ذاتی کام کرادیا تھا، یہ ووٹ دینے کے لیے ہمیں پیسے دے رہا ہے درست نہیں ہے، یہ خیانت اور جھوٹی گواہی ہے، اور یہ پیسے رشوت ہیں ہر شخص اس کے بارے میں اللہ کے یہاں جواب دہ ہے، ایسا شخص ایک دو نہیں بلکہ پوری قوم کے ساتھ بدخواہی کا مرتکب ہے، اس لیے ووٹ کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے، تمام امیدواروں پر غور کرنا چاہیے اس کی گذشتہ زندگی اور عام لوگوں کے ساتھ اس کے سلوک اور رویہ کا بھی جائزہ لینا چاہیے اور پھر جس امیدوار کو بہتر اور مفید تصور کرتا ہے اسکے حق میں ووٹ دینا چاہیے ووٹر کے لیے یہی اصل کامیابی ہے، جس کے حق میں اس نے ووٹ کا استعمال کیا ہے اگر وہ ہار گیا تب بھی ووٹ دینے والا اپنے مذہبی فریضہ اور قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہے، وہ اللہ کے یہاں خیانت کا مرتکب تصور نہ کیا جائے گا، اور اگر ایسے امیدوار کو ووٹ دیا جائے جو قوم کے لیے مفید نہیں، مضر ہے تو گو وہ امیدوار جیت جائے پھر بھی ایک مسلمان ووٹر کے لیے یہ ہار ہی ہے، کیوں کہ وہ اپنے اس غلط عمل کی بابت عنداللہ جواب دہ ہے اور خدا کے ترازو میں اس کا یہ عمل قابل مواخذہ ہے۔

انوار حدیث

☆ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص وہ ہے جو سخت جھگڑالو ہو۔ (مسلم)

☆ حضرت ابوبکر صدیقؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے یا اس کو دھوکہ دے وہ ملعون ہے۔ (ترمذی)

☆ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں دو باتیں کفر کی ہیں؛ نسب میں طعن کرنا اور مُردوں پر نوحہ کرنا۔ (مسلم)

خلع کے چند مباحث

مفتی راشد حسین ندوی

لغت میں "خلع الثوب" کے معنی کپڑے اتارنے اور جسم سے علیحدہ کرنے کے ہیں، اسلام میں میاں بیوی کے درمیان علاحدگی کی تعبیر اس لفظ سے کرنے کا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے ﴿هن لباس لكم وانتم لباس لهن﴾ لہٰذا ان کا علاحدگی اختیار کرنا گویا لباس ہٹانے کے مترادف ہے۔

فقہی تعریف: اور شریعت کی اصطلاح میں خلع نام ہے کچھ عوض لے کر لفظ خلع کے ذریعہ ملک نکاح کے ازالہ کا۔

(ہندیہ: ۱/۴۸۸)

اور تنویر ابصار میں اس کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "لفظ خلع یا اس کے ہم معنی الفاظ کے ذریعہ ملک نکاح کا ازالہ جو کہ عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہوتا ہے"۔ (شامی: ۲/۶۰۴)

خلع کس کا حق ہے؟ اوپر خلع کی تعریف میں یہ بات آئی کہ خلع نام ہی ہے کچھ لے کر ملک نکاح ختم کرنے کا، ان الفاظ ہی سے واضح ہے کہ خلع کا اختیار مرد کو ہوتا ہے، اس لیے کہ ملک نکاح اسی کے پاس ہوتی ہے، لہٰذا اس کو ختم کرنے کا اختیار بھی اسی کو ہوگا، البتہ کچھ مخصوص حالات میں یہ اختیار حاکم کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے، چنانچہ اسی طرح کی حالت پر بحث کرتے ہوئے علامہ شامی فرماتے ہیں: "جب وہ بھلائی کے ساتھ بیوی کو رکھنے پر قادر نہیں تھا تو اس پر لازم تھا کہ حسن سلوک کے ساتھ اس کو چھوڑ دیتا، تو جب اس نے اس سے گریز کیا تو وہ ظالم ہوا، لہٰذا قاضی اس کا نائب بن گیا اور اس کا فعل اس کی طرف منسوب کر دیا گیا" (شامی: ۲/۶۷۴)

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ خلع بھی طلاق ہی کا ایک طریقہ ہے جس کا اختیار مرد ہی کو ہوا کرتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض حضرات طلاق کے بجائے خلع کو فسخ قرار دیتے ہیں، لیکن وہ بھی اس کا اختیار مرد ہی کے پاس رکھتے ہیں، علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: "خلع کی ماہیت میں اختلاف ہے، ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ وہ طلاق ہے، یہ قول حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے مروی ہے، اور امام شافعیؒ کے دو قول ہیں، ایک قول ہمارے قول کے مثل ہے، اور ایک قول کے مطابق وہ طلاق نہیں بلکہ فسخ ہے، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے"۔ (بدائع: ۳/۲۲۷)

اور علامہ ابن رشد مالکیؒ فرماتے ہیں: "رہی خلع کی نوع، تو جمہور فقہاء اس رائے پر ہیں کہ وہ طلاق ہے یہی قول امام مالک کا بھی ہے، اور امام ابوحنیفہؒ نے طلاق اور فسخ کو برابر قرار دیا ہے، اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں وہ فسخ ہے، یہی قول امام احمدؒ، داؤد ظاہریؒ اور صحابہ میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔

(بداية المجتهد ۲/۶۹)

جو حضرات خلع کو طلاق قرار دیتے ہیں، ان کے یہاں تو مسئلہ بالکل واضح ہے کہ جب وہ طلاق ہے تو "الطلاق بالرجال" (طلاق مردوں کے ذریعہ ہوتی ہے) کے تحت اس کا اختیار مرد ہی کو ہوگا، اور جو حضرات اس کو فسخ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بھی تفریق کے لیے فریقین کی رضامندی شرط ہے لہٰذا مکمل اختیار عورت کو کہاں حاصل ہوا جب کہ مرد کی رضامندی کے بغیر فسخ ممکن نہیں؟ علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں: "حکمین کے بارے میں امام احمد سے مختلف روایات ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ دونوں حکم فریقین کے وکیل ہیں، ان دونوں کی اجازت کے بغیر تفریق کا اختیار نہیں رکھتے، یہ حضرت عطاؒ کا مسلک ہے، امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے، اور حضرت حسن بصریؒ اور امام ابوحنیفہؒ سے بھی منقول ہے"۔ (المغني: ۷/۳۲۱)

اس طرح جمہور کے نزدیک خلع بھی شوہر کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا، البتہ اگر میاں بیوی کے درمیان شقاق ہو جائے تو بعض ائمہ کے یہاں شوہر کی مرضی کے بغیر بھی تفریق ہو سکتی ہے۔

شقاق کی حقیقت: شقاق کے لغوی معنی حد درجہ دشمنی اور اختلاف ہو جانے کے ہیں (لسان العرب) علامہ آلوسی اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "شقاق اختلاف اور عداوت کو کہتے ہیں، اس کا اشتقاق شق بمعنی جانب سے ہے، اس لیے کہ دونوں اختلاف رکھنے والے دوسرے کی مخالف شق اور سمت میں

ہوتے ہیں آگے فرماتے ہیں یعنی دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہوں"۔ (روح المعانی: ۵/۲۶)

خلاصہ کلام یہ کہ شقاق کے معنی عداوت ودشمنی اور مخالفت کے ہیں اور چوں کہ یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے اس لیے اس کے معنی ہیں باہم شقاق میں اس حالت پر ہوجانا کہ ایک شخص ایک شق پر ہو یعنی ایک سرے پر ہو، اور دوسرا شخص دوسری شق پر ہو، یعنی دوسرے سرے پر ہو، یعنی دو آدمیوں کے درمیان شقاق (عداوت، دشمنی، مخالفت) نے انتہا کی صورت اختیار کرلی ہو۔

شقاق کے بارے میں اختلاف: ائمہ اربعہ اور ان کے ہم پلہ دوسرے ائمہ کے اقوال ومسالک دیکھنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ شقاق ہونے پر کسی کے نزدیک بھی حاکم خود سے نکاح فسخ نہیں کرسکتا بلکہ اس کے متعلق آنے والی آیت کریمہ، مختلف آثار اور تمام مسالک کی کتابوں میں مذکور ہے کہ حکمین بنانا ضروری ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُواْ حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلاَحاً يُوَفِّقِ اللّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلِيماً خَبِيراً﴾ (النساء: ۳۵) (اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں شقاق (ضد) رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورتوں والوں میں سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرادیں تو اللہ تعالی موافقت کر دے گا ان دونوں میں)۔

اس بارے میں حضرت علیؓ کا اثر بھی بالکل صاف ہے، چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس شوہر اور اس کی بیوی آئے....... حضرت علیؓ نے فرمایا: مرد کے خاندان میں سے ایک حکم اور عورت کے خاندان میں سے ایک حکم بھیجو۔

(احکام القرآن: ۲/ ۱۹۲)

مفتی رشید احمد لدھیانویؒ مختلف فقہاء کی عبارت نقل کرنے کے بعد خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،: حاکم کو بذات خود بلا نصب حکمین یہ اختیار نہیں"۔ (احسن الفتاوی: ۵/ ۴۰۲)

ان نصوص وعبارات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کسی بھی امام کے نزدیک قاضی کو بذات خود فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہے، البتہ امام مالک اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک حکمین کو فسخ نکاح کا اختیار ہے، چنانچہ علامہ ابن رشدؒ فرماتے ہیں: فقہاء کا حکمین کے تفریق کرنے کے بارے میں اس صورت میں اختلاف ہے جب دونوں حکم تفریق پر متفق ہوں کہ آیا اس کے لیے شوہر کی اجازت کی حاجت ہوگی یا نہیں؟ تو امام مالکؒ اور ان کے اصحاب کا قول ہے کہ زوجین کی توکیل یا ان کی اجازت کے بغیر ہی تفریق اور میل کرانے میں ان کا قول جائز ہوگا، اور امام شافعی وابوحنیفہ اور دونوں کے اصحاب فرماتے ہیں کہ ان کو تفریق کا اختیار نہیں ہوگا، الا یہ کہ شوہر ان کو تفریق کا وکیل بنادے۔ (بدایۃ المجتہد: ۲/ ۹۹)

شقاق کی صورت میں امام مالک کے قول کا اختیار کرنا: اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات بیوی شوہر سے متعلق اپنی شکایات بینہ سے ثابت نہیں کر پاتی، اور ان شکایات کا بینہ سے ثابت کر پانا مشکل ہے بھی، لیکن کبھی عداوت ودشمنی اس حد تک بڑھ چکی ہوتی ہے کہ عورت شوہر کے یہاں جانے میں جان تک کا خطرہ محسوس کرتی ہے لہذا قاضی اگر رخصتی کا حکم دے تو اس پر عمل نہیں ہو پائے گا اور عورت الگ شادی بھی نہیں کر سکے گی، لہذا اس کے مظلوم ہونے میں کوئی شبہ نہیں اس لیے فقہاء احناف نے بھی اس طرح کے حالات میں مالکیہ کا قول اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: ہمارے زمانہ میں جہالت اور احکام شرع سے بے خبری اور اس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں ظلم وزیادتی اور اختلافات کی روشنی میں اگر اس مسئلہ میں فقہ مالکیہ کی رائے قبول کرلیں گے تو شاید مناسب ہو۔

(طلاق وتفریق: ۱۰۳)

اور مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی لکھتے ہیں: "امارت شرعیہ پٹنہ صوبہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ کے دار القضاء میں عملاً اس بنیاد پر مشائخ حنفیہ نے بوقت ضرورت دوسرے ائمہ کے مسلک پر عمل کو جائز لکھا بلکہ عمل کیا ہے، حسب ذیل بنیادوں پر عورت کی اس کے شوہر سے تفریق کی جاتی ہے: پھر ۱۴ ار پر ہے: ۱۴- زن وشوہر میں شقاق ہونا۔ (کتاب الفسخ، ص: ۶۰-۶۱)

اتنے قدیم اور معتبر دار القضاء کے عملاً قبول کر لینے کے بعد ہمارے لیے اس مسئلہ میں مالکیہ کے مسلک کو اختیار کرنا مزید آسان ہوگیا ہے۔ واللہ اعلم

تنقید جب حد سے گذر جائے

جناب ابو ھاجر

اس عصر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر شخص غیر مطمئن اور شاکی نظر آتا ہے، لیکن اپنی پریشانیوں اور دشواریوں کی ذمہ داری وہ خود قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، وہ ہر شخص اور ہر کام کو ناقدانہ ذہن سے دیکھتا ہے اور ہر خیر اور قابل ستائش کام کو اپنی طرف یا اپنے حلقہ کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور ہر برائی کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالتا ہے، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو کسی مسئلہ سے دلچسپی لیتے ہوئے دیکھتا ہے تو فوراً بغیر تحقیق کے اس پر الزام لگا دیتا ہے کہ اس میں اس کی کوئی غرض ہوگی، اس کی محنت وجانفشانی کو تجسس کی نگاہ سے دیکھے گا اور کوئی مصلحت یا غرض اس میں تلاش کرلے گا پھر اس خیالی مصلحت کو حقیقت قرار دے گا، اور اس پر یقین کرنے پر اصرار کرے گا۔

ہر شخص اپنا معیار اور ذوق رکھتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ ذوق حقیقی اور معیار خود معیاری ہو، اس لیے کہ ذوق اور معیار پسندیدگی یا ناپسندیدگی حالات اور تعلیم وتربیت اور گھر کے ماحول اور ذہنی حالت پر منحصر ہوتا ہے، اور وہ صحیح اور اصولی بھی ہوتا ہے اور غلط بھی لیکن اس کی فکر کیے بغیر کہ اپنے ذوق اور معیار میں کتنی صداقت اور درست رجحانات ہیں ہر شخص اپنے تصور کو اصلی معیار سمجھ کر دوسروں کی تحریر وتقریر، طریق کار اور فکر وعمل اور اخلاق ومعاملات پر بلا تردد تنقید کر بیٹھتا ہے اور اس کے سامنے دوسرے کے مخصوص حالات اور اس کے طرز عمل کے عوامل ودواعی اور مجبوریاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، وہ اس سلسلہ میں نہ زیادہ تحقیق کرتا ہے کہ اسباب وعوامل معلوم کرے اور اس کے بعد رائے قائم کرے اور نہ رائے ظاہر کرنے میں احتیاط برتتا ہے، اور نہ ہدف تنقید بننے والی شخصیت کی حیثیت اور کردار وخدمات کا اعتبار اور احترام ملحوظ رکھتا ہے۔

اس زمانہ میں کوئی مجلس چاہے وہ تفریحی ہو، یا علمی، چائے خانہ ہو، یا کافی ہاؤس، بازار ہو یا گھر کا ماحول، ٹرین کا سفر ہو یا بس کا، ہر جگہ اور ہر وقت ایک محبوب موضوع، شخصیات پر تنقید اور حالات کا شکوہ ہے اس تنقید کا دائرہ گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے، اپنی ذات کو مستثنیٰ کر کے ہر شخص اعزا واقربا، دفتر یا ادارے کے ذمہ دار، شہر کی انتظامیہ کے ذمہ دار اور کارکن قائدین مصلحین، ریل اور بس کے نظام کے ذمہ دار اور زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والوں کو ہدف تنقید بناتا ہے۔

اخبار پڑھنے والوں کا دائرۂ تنقید پوری دنیا کے حکمرانوں اور سیاست دانوں اور مفکروں تک وسیع ہوتا ہے، کھیل سے دلچسپی رکھنے والے کھیل کے ذمہ داروں کھلاڑیوں اور امپائروں پر تنقید کرتے ہیں اور ان تبصروں میں کئی کئی گھنٹے صرف کرتے ہیں، تنقید کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تنقید کرنے والا اس میدان میں اس شعبہ سے وابستہ صاحب اختصاص سے زیادہ سمجھ اور تجربہ رکھتا ہے اور اس معاملہ میں اس سے زیادہ مخلص اور فکر مند ہے۔

ناقدانہ تبصرہ اس زمانے کا شعار بن گیا ہے، بعض وقت کئی کئی گھنٹے مجلس میں صرف دوسروں پر تبصرہ یا تنقید ہوتی ہے اس مشغولیت میں اپنی ذمہ داریوں سے بے اعتنائی، یا اپنی کارکردگی پر نظر ڈالنے کا موقع نہیں ملتا دوسروں پر نظر ڈالنے کی عادت بن جاتی ہے، اپنے محاسبہ یا اپنے کام کی اصلاح کی نوبت نہیں آتی، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مجلس مین کسی ایک شخص پر تنقید ہو رہی ہے کچھ دیر کے بعد کوئی الگ شخص اس مجلس سے اٹھ کر جاتا ہے تو فوراً مجلس کی تنقید کا رخ اس کی طرف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی شعبہ کا ذمہ دار ہے تو وہ اپنے دائرۂ کار کو چھوڑ کر دوسرے سارے شعبوں پر تنقید کرتا ہے، کوتاہی اور بدعنوانی کے الزامات لگاتا ہے، دوسری مجلس میں اسی کے احباب اور ساتھی اس کے دائرہ کار پر تنقید کرتے ہیں اور اسی طرح کے الزامات لگاتے ہیں جس طرح کے الزامات وہ خود دوسروں پر لگاتا ہے۔

ایسی کسی مجلس میں بیٹھنے سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ برائی ہے اور ہر شخص بے عمل یا کوتاہ عمل ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر شخص یہ کہتا ہوا اٹھتا ہے کہ بھائی کیا کیا جائے، یہ زمانہ اچھائی کا نہیں ہے اچھائی کرنا ہے تو الگ تھلگ رہنا ہوگا گویا وہ یہ عزم کر کے اٹھتا ہے کہ برائی ہی ایک راہ ہے، دوسری کوئی راہ عمل نہیں اور دنیا برائی ہی کی جگہ ہے اور کوئی بڑے سے بڑا آدمی اس سے محفوظ نہیں ہے یہ کتنا غلط اور نقصان دہ تاثر ہے۔

اظہار رائے اچھی بات ہے، لیکن برائی کا چرچہ اچھا مشغلہ نہیں ہے تنقید کرتے وقت اگر یہ سوچا جائے کہ خود اپنے میدان عمل میں تنقید کرنے والے کا کیا کردار ہے اور اس کی کارکردگی میں کتنے نقائص ہیں، اور وہ اپنے محدود پیمانہ پر کیا تعمیری رول ادا کرسکتا ہے یا کتنی برائیوں کو کم کرسکتا ہے، تو بڑی حد تک اصلاح ہوسکتی ہے جتنا وقت باتوں میں صرف ہوتا ہے اس کا کچھ حصہ کام اور فکر کو دے دیا جائے تو بڑی سماجی تبدیلی لائی جاسکتی ہے نظر دوسروں سے زیادہ اپنے پر ہونی چاہیے دوسروں کی کمزوری بیان کرنے سے ہماری زندگی کی تعمیر نہیں ہوسکتی۔

جائزہ اور تنقید تعمیر کے لیے کسی حد تک ضروری ہے لیکن دوسروں کے اعمال اور افکار کے جائزے اور تنقید سے بہتر اپنا جائزہ اور اپنے پر تنقید ہے اسلام میں محاسبہ نفس اصلاح اور ترقی کی پہلی منزل ہے لیکن فکر وتدبر اور محاسبہ ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی سے ختم ہوتا جارہا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ تعلقات اور اجتماعی زندگی افتراق اور بغض ونفرت کا شکار ہورہی ہے اور قوت عمل میں کمی آرہی ہے۔

تنقید اور شکوہ کے وقت اگر یہ سوچ لیا جائے کہ تنقید کرنے والا خود اس جگہ ہوتا تو اس کا کیا موقف ہوتا تو تنقید اور شکوہ کا دائرہ تنگ ہوسکتا ہے، بعض بڑے تنقید کرنے والوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے محدود دائرۂ عمل میں ناکام ہوتے ہیں۔

یہ رجحان بے کاری سے اور اکثر انانیت سے پیدا ہوتا ہے، اس کا شکار افراد بھی ہوتے ہیں اور جماعتیں بھی بعض لوگوں کا اہم مشغلہ ہی دوسروں کے عیوب کی تلاش کرنا ہوتا ہے، وہ اہل قلم ہیں تو اپنی قوت تحریر اس تخریبی مشغلہ میں صرف کرتے ہیں، اور اگر سیاست داں ہے تو دوسروں کے کاموں کی تخریب، اور کردار کشی میں طاقت صرف کرتے ہیں، یہ رویہ حقیقت میں انسانی صلاحیت پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے اس طرح کے لوگ کام کرنے والوں کا دل توڑتے ہیں اور ہمت شکنی کرتے ہیں، جو بڑے قومی نقصان کا سبب بنتا ہے، اس سے اپنا جو ذاتی نقصان ہوتا ہے وہ ناقابل تلافی ہے کام نہ کرنا کوتاہی ہے، لیکن کام کرنے والوں کو کام سے دل برداشتہ کرنا یا کام سے روکنا سنگین قومی اور اخلاقی جرم ہے۔

ذکر الٰہی کی اہمیت

عبدالرحمٰن ندوی

اللہ کا ذکر وہ عمل ہے جس سے انسان اونچے سے اونچے مرتبے حاصل کرتا ہے، دنیا کی آلائشوں سے پاک ہونے، گناہوں کے کے دلدل سے باہر نکلنے کا سب مؤثر ذریعہ یہی ذکر الٰہی ہے۔ اس ذکر کے ذریعہ بندہ نفس اور دنیا کی پستیوں سے نکل کر بلندیوں تک پہنچتا ہے، اللہ کے حضور میں اس کا تذکرہ ہوتا ہے، فرشتوں میں اس کا چرچا ہوتا ہے، اور پھر دنیا میں بھی اس کی محبت کی نداء لگادی جاتی ہے۔ ذکر الٰہی کی پابندی سے بندہ کو ایک خاص کیفیت حاصل ہوتی ہے جس سے غفلت دور ہوتی ہے، اور استحضار کی کیفیت نصیب ہوتی ہے۔

دل میں اللہ کی یاد رچ بس جائے تو انسان کے قویٰ اور جوارح سبھی کچھ اللہ کی مرضی اور اس کی پسند کے مطابق کام کرنے لگتے ہیں جس سے وہ کمال بندگی کی طرف بڑھتا ہے، اور اطاعت اور فرمانبرداری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، اللہ کی رحمتیں اور سکینت اس پر نازل ہوتی ہے، اور اطمینان کی وہ دولت حاصل کرلیتا ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے سلطنتوں کو قربان کرنا اور زندگی کی پوری پونجی لٹادینا بہت ہی معمولی ہے، اور کیوں نہ ہو اللہ جل شانہ فرما چکا ہے "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" (یاد رکھو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے)

جو شخص بھی ذکر الٰہی سے غافل ہوتا ہے وہ گمراہی میں پڑجاتا ہے، شیطان اسے آسانی سے اچک لیتا ہے، اور پھر گمراہی میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ شیطان کے مکروفریب میں آجاتا ہے، نفسانی خواہشات کا غلام بن کر اپنی حقیقت کو بھلا بیٹھتا ہے، اور آہستہ آہستہ ان کاموں میں الجھ کر رہ جاتا ہے جن کاموں سے انسان جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔

اللہ کا ذکر مختلف تسبیحات اور دعاؤں کے اہتمام سے بھی کیا جاتا ہے، لیکن اس کا سب اہم اور مؤثر طریقہ نماز کی پابندی اور اس کا اہتمام ہے، خود فرمان الٰہی ہے: "اقم الصلوٰۃ لذکری" یعنی میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔

عورتوں کا لباس کیسا ہو؟

مفتی محمد احمد علی

شرم وحیاء فطرت انسانی کا تقاضہ ہے، اہل ایمان کے لیے تو یہ ایک ایسا وصف ہے کہ اسلام میں حیاء اور ایمان کو لازم ملزوم اور بے حیائی و بے شرمی کو فطرت کے تقاضوں اور شرافتی اصولوں کے خلاف قرار دیا گیا ہے، خاص طور پر جسم کے مخصوص اور قابل ستر حصوں کا چھپانا صرف انسانوں کی فطری اور طبعی ضرورت کا تقاضہ ہی نہیں، بلکہ اسلامی شریعت کا تاکیدی اور اولین حکم ہے یہی چیز شرافت اور انسانیت کی دلیل، اور عفت وعصمت کے تحفظ کا ذریعہ اور اخلاق وکردار کی بلندی کا وسیلہ ہے، جس کی تکمیل لباس شرعی سے ہوتی ہے، اس لیے لباس کے بنانے اور اس کے اختیار کرنے میں شریعت اسلامی کے اصول اور احکام کو مدنظر رکھنا ضروری ہے چونکہ لباس کا زندگی پر اور اور اخلاق وکردار پر بڑا اثر ہوتا ہے، اجتماعی زندگی اور معاشرتی نظام بھی لباس کے اثرات نیک وبد سے متاثر ہوتا ہے اس لیے قرآن مجید وحدیث پاک میں بھی اس سلسلہ میں نہایت معتدل تعلیمات موجود ہیں لباس کا بنیادی مقصد بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿یَا بَنِیْ آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاساً یُوَارِیْ سَوْءَاتِکُمْ وَرِیْشاً﴾ (الاعراف : ۲۶) اے اولادِ آدم! ہمارے انعامات میں سے ایک انعام یہ بھی ہے کہ ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا جو تمہارے ستر یعنی پردہ والے اعضائے جسم کو بھی چھپاتا ہے اور تمہارے بدن کے لیے موجب زینت بھی ہوتا ہے، "سوأۃ" ان اعضائے جسمانی کو کہا جاتا ہے جس کے کھلنے کو انسان فطرۃً برا اور قابل شرم سمجھتا ہے، اس کا بنیادی مقصد ستر چھپانا ہے، اور عورت کا سارا جسم سوائے چہرہ اور ہاتھوں کے گٹوں تک سب کا سب ستر ہے، جس کا چھپانا فرض اور کھولنا حرام ہے، جو اس مقصد کو پورا کرتا ہے وہی لباس شرعی ہے۔

لباس شرعی کی تکمیل تین صورتوں میں ہوتی ہے؛ پہلی صورت یہ ہے کہ لباس اتنا لمبا ہو کہ پورے اعضائے ستر کو گھیر لے، سر پیٹ، پیٹھ اور بازو، کوئی حصہ بھی جسم کا کھلا ہوا نہ ہو، زمانہ جاہلیت میں عورتوں کا دستور تھا کہ دوپٹہ سر پر ڈال کر اس کے دونوں کناروں کو پشت پر چھوڑ دیتی تھیں، جس سے گریبان، گلا، سینہ اور کان کھلے رہتے تھے، اس صورت حال میں مسلمان عورتوں کو قرآن نے حکم دیا کہ ﴿وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَی جُیُوبِهِنَّ﴾ (النور: ۳۱) اور عورتیں اپنے دوپٹے [جو سر ڈھانکنے کے لیے ہیں] اپنے سینے پر ڈالا کریں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں اللہ تعالی ان عورتوں پر رحم فرمائے جنہوں نے ابتدائی دور میں ہجرت کی، جب اللہ نے آیت ﴿وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَی جُیُوبِهِنَّ﴾ نازل کر کے عورتوں کو دوپٹہ سے سر ڈھانکنے کا حکم دیا تو انہوں نے اپنی موٹی چادریں کاٹ کر دوپٹے بنالیے۔ (ابوداؤد شریف: ۲/۵۶۷)

آج بڑی لاپرواہی اور غفلت سے عورتیں سر اور بعض سینہ بھی کھلے رکھتی ہیں، یہ بے حیائی کی بات ہے، لباس شرعی کی تکمیل اسی وقت ہوگی جب کہ سر سینہ اور بازو بھی کپڑے سے چھپے ہوئے ہوں.

دوسری صورت یہ ہے کہ لباس اتنا موٹا ہو کہ اس سے اندر کا بدن نہ جھلکتا ہو، لباس اگر اتنا بڑا ہو کہ اس قابل شرم اعضاء تو چھپ جائیں، لیکن باریک اس قدر ہو کہ بدن جھلکتا ہو تو لباس شرعی نہیں کہا جائے گا، حضرت دحیہ بن خلیفہؓ کہتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مصر سے کچھ قبطی چادریں آئیں، تو آپ ﷺ نے ان میں سے ایک مجھ کو عنایت فرمائی، اور ارشاد فرمایا کہ اس کے دو ٹکڑے کر لینا، ان میں سے ایک کا کرتا بنالینا، اور دوسرا ٹکڑا اپنی بیوی کو دے دینا، وہ اس کا دوپٹہ بنالے گی، میں اس کو لے کر جب جانے لگا تو آپ ﷺ نے روک کر ارشاد فرمایا کہ: اپنی بیوی کو بتلا دینا کہ اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگا لے تاکہ اس کے بال اور جسم نظر نہ

آئیں۔(ابوداؤد شریف:۲/۵۶۸) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میری بہن اسماء بنت ابی بکر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھی تو آپ نے ان کی طرف سے منھ پھیر لیا، اور فرمایا: اے اسماء جب عورت بلوغ کو پہنچے تو درست نہیں کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے سوائے چہرے اور ہاتھوں کے (ابوداؤد شریف:۲/۵۶۷) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ان کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی بیٹی حفصہ پہنچی، انہوں نے باریک دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا، حضرت عائشہ نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے کر پھاڑ دیا اور اپنے پاس سے ایک موٹا دوپٹہ اوڑھا دیا، (مؤطا امام مالک: ۳۶۶) حضرت عائشہ کا لباس کے سلسلہ میں یہ طرز عمل درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے باریک کپڑے کو اگرچہ وہ دوپٹی ہی کیوں نہ ہو بالکل پسند نہیں فرمایا۔

مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے باریک کپڑے کی اوڑھنی دوپٹہ بھی استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے تو دیگر کپڑوں کے بارے میں کس قدر احتیاط کی گئی ہوگی! ہمارے زمانے میں فیشن کی وبا اور غلط رواج سے باریک سے باریک کپڑا استعمال کرنے کو عزت وشرافت تصور کیا جارہا ہے، جو سراسر حیاء وشرم کے تقاضوں کے خلاف ہے، جو لباس کی صورت میں ننگا پن اور عریانیت ہے، ہاں اگر بازار میں ایسے ہی باریک کپڑے ملتے ہوں تو اس کو استر لگا کر استعمال کرسکتے ہیں، جیسے کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابیؓ کو تاکید کی کہ بیوی سے کہہ دینا کہ استر لگا کر دوپٹہ بنائیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ: لباس اس قدر ڈھیلا ہو کہ اندر کے اعضاء نمایاں نہ ہوں، ظاہر بات ہے کہ لباس اس قدر چست اور ٹائٹ ہو کہ اعضاء کی ہیئت صاف طور پر محسوس ہونے لگے تو اس لباس کا فائدہ ہی کیا ہے،؟ بہرحال لباس اتنا بڑا ہو کہ پورا بدن اس سے چھپ جائے، اور اتنا موٹا ہو کہ جسم کے اعضاء باہر نہ جھلکتے ہوں، اور اس قدر ڈھیلا ڈھالا ہو کہ اعضاء بدن کی ہیئت نمایاں نہ ہوتی ہو یہی شرعی لباس ہے، اور اگر لباس چھوٹا، یا بہت ہی باریک ہو، یا پھر ٹائٹ اور چست ہو تو یہ بے لباسی اور عریانیت ہے، یعنی اس کا پہننا اور نہ پہننا دونوں برابر ہے، ایسے لباس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایسے ہی بے حیائی کا لباس استعمال کرنے والی عورتوں کے بارے میں سخت وعید بیان کی گئی ہے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ دوزخیوں کی دو جماعتیں میں نے دیکھیں (کہ ایک ابھی وہ موجود نہیں ہوئی بعد میں ان کا وجود ہوگا) ایک جماعت ان لوگوں کی ہوگی جن کے پاس بیل کی دموں کی طرح کوڑے ہوں گے ان سے لوگوں کو ماریں گے، دوسری جماعت ایسی عورتوں کی ہوگی جو کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی، مگر اس کے باوجود ننگی ہوں گی مردوں کو مائل کرنے والی اور خود ان کی طرف مائل ہونے والی ہوں گی، ان کے سر خوب بڑے بڑے اونٹ کے کوہانوں کی طرح ہوں گے، جو جھکے ہوئے ہوں گے یہ عورتیں نہ جنت میں داخل ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو سونگھیں گی۔ (مسلم:۲/۲۰۵)

یہ لباس کے سلسلہ میں اسلام کی تعلیمات مبارکہ ہے، جو ہر عورت کے لیے سرمایۂ نجابت وشرافت اور تحفظ عفت وعصمت کا ذریعہ ہے اس کو چھوڑ کر فیشن کی پیروی کرنا اور مغربی تہذیب کو اختیار کرنا بڑی ناقدری کی بات ہے، آج لباس کے سلسلہ میں اسلام کی ان تعلیمات کو نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں معاشرہ بڑی تیزی کے ساتھ فواحش ومنکرات کے سیلاب میں بہا جارہا ہے، اخلاق و شرافت کا نام ونشان مٹتا جارہا ہے اس لیے خواتین اسلام اپنے لباس شریعت کے اصولوں کی روشنی میں بنائیں، یہ چیز ان کے لیے بھی خیر کا باعث ہوگی اور معاشرہ کی پاکیزگی کا بھی ذریعہ ہوگی۔

اخلاق یورپ

''یورپ کے اخلاق میں توازن نہیں، ان کی مثال وہی ہے کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، افراد کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں وہ بڑی ایمانداری سے کام لیتے ہیں، لیکن جب اپنی قوم کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو ایسے ایماندار افراد قوموں کو نگل جاتے ہیں، انفرادی زندگی میں ان کا حال یہ ہے کہ اگر نو بج کر بارہ منٹ پر آنے کا وعدہ کریں تو ٹھیک اسی وقت پہنچیں، لیکن قومی معاملات میں دوسری قوموں کو دھوکہ دینے میں انہیں ذرا تأمل نہیں!''

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

نکاح میں مہر کی ضرورت اور اس کی شرعی حیثیت

مفتی شعیب احمد بستوی

نکاح کا ایک جزء لازم مہر ہے، بغیر مہر کے نکاح نہیں ہوسکتا، قرآن کریم کی آیت کریمہ "ان تبتغوا باموالکم" اس کی دلیل ہے، البتہ شرعاً اس کو یہ مقدار متعین نہیں ہے۔

اس حکم شرعی کے علاوہ علماء نے نکاح میں مہر کے لازم ہونے کی بہت سی حکمتیں بھی بیان کی ہیں چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس کی بہت سی حکمتیں بیان کی ہیں، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

پہلی مصلحت تو یہ ہے کہ مہر سے نکاح مؤکد اور پائدار ہو جاتا ہے، کیونکہ نکاح ایک وقتی ضرورت نہیں بلکہ ایک دائمی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ دائمی ضرورت اس وقت مکمل ہوگی جب زوجین دائمی رفاقت کا اپنے کو خوگر بنائیں، عورت کی طرف اس کی تکمیل تو اس طرح ہوتی ہے کہ ایجاب وقبول کے بعد عورت بندھ جاتی اور پابند ہو جاتی ہے، اب نکاح سے نکلنا اس کے بس سے باہر ہوجاتا ہے، دوسری طرف مرد بالکل بااختیار اور آزاد ہوجاتا ہے کہ جب چاہے اسے طلاق دے کر نکاح سے الگ کردے، اب مرد کے اس اختیار کو کم کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اسے بھی طلاق کا بھی اختیار نہ دیا جاتا، اور وہ بھی عورت کی طرح بے بس اور مجبور ہو جاتا، لیکن یہ چیز اس کی شان حاکمیت ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (النساء:۳٤) کے خلاف اور دونوں کے لیے پریشانی کا سبب ہوتی، اس لیے اس میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے مہر کو لازم کیا گیا، تاکہ شوہر جب بھی طلاق دینے کا ارادہ کرے تو ایک معتد بہ مالی نقصان نگاہوں کے سامنے رہے اور انتہائی مجبوری کے وقت ہی یہ قدم اٹھائے۔

دوسری مصلحت یہ ہے کہ اس سے نکاح کی عظمت اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے، بغیر مال خرچ کیے نکاح کی کوئی عظمت اور حیثیت ہی نہ ہوتی، کیونکہ انسان دنیا میں جتنا حریص مال کا ہے اتنا کسی اور چیز کا نہیں ہے مال خرچ کرنا انسان پر انتہائی شاق گذرتا ہے، ضروری اور باعظمت امور میں ہی انسان مال خرچ کرتا ہے۔

نیز مہر عورت کے اولیاء کی دلی خوشی کا باعث بنتا ہے کیوں کہ ان کی لخت جگر اور نور نظر کا اگر کوئی مالک بن رہا ہے، اس سے متمتع ہو رہا ہے تو بالکل مفت اور بے وقعت چیز کی طرح نہیں بلکہ قیمتی اور باوقعت چیز کی طرح مال خرچ کرکے، اس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

مہر کی مقدار متعین نہ ہونے کی وجہ : جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ مہر ضروری تو ہے لیکن شریعت کی طرف سے کم سے کم مقدار تو متعین ہے البتہ زیادہ کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے، اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ نکاح کی رغبت کے اعتبار سے لوگوں کی عادت مختلف ہوتی ہے، کسی میں رغبت بہت زیادہ ہوتی ہے، کسی میں اوسط درجہ کی ہوتی ہے کسی میں بہت کم اور کسی میں نہ کے درجہ میں ہوتی ہے۔

دوسرے مالی اعتبار سے لوگوں کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں، اس لیے اگر کوئی مقدار متعین کردی جاتی تو لوگوں کے لیے اس پر عمل کرنا انتہائی دشوار بلکہ بعض وقت ناممکن ہوجاتا، اس لیے کوئی مقدار متعین نہیں کی تاکہ لوگ اپنے حالات کے اعتبار سے خود ہی اس کا تعین کرلیں۔

کم سے کم مہر: کم سے کم مہر دس درہم ہے یعنی اس سے کم مہر نہیں ہوسکتا گراموں کے اعتبار سے اس کا وزن ۳۰ گرام ۶۱۸ ملی گرام چاندی ہے۔

مہر مثل : کتابوں میں نکاح کے بیان میں مہر مثل کا تذکرہ ملتا ہے، یہ کیا چیز ہے تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا نکاح ہوا، اور اس میں مہر کا تذکرہ نہیں آیا یا تذکرہ تو آیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ نکاح بغیر مہر کے ہوگا، تو ان دونوں صورتوں میں فقہاء کہتے ہیں کہ شوہر پر مہر مثل لازم ہوگا۔

مہر مثل ہے کیا؟ اس عورت کے خاندان میں حسن وجمال اور عمر وغیرہ کے اعتبار سے جو عورتیں اس کی ہم پلہ ہوں اور جو مہر ان کا مقرر ہے وہی اس عورت کے لیے مہر مثل ہوگا، اور خاندا سے مراد اس کی بہنیں، پھوپھیاں، چچازاد بہنیں، پھوپھی زاد بہنیں ہیں۔

مہر فاطمی : جنتی عورتوں کی سردار، حبیب کبریاء صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جو مہر متعین ہوا تھا اسی کو عرف وشرع میں مہر فاطمی کہتے ہیں، اس کی مقدار پانچ سو درہم تھی جس کا وزن علماء نے ایک سو اکتیس تولہ تین ماشہ لکھا ہے، اور اب گراموں

کے اعتبار سے ڈیڑھ کلو تیس گرام ۹۶۰ ملی گرام چاندی بنتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: لوگ بوقت نکاح مہر فاطمی چاندی تو بندھوا لیتے ہیں اور جب کبھی اس کی ادائیگی کا خیال آتا ہے یا کسی مجبوری (طلاق وغیرہ) کے تحت ادا کرنا پڑتا ہے تو اس کی قیمت لگاتے ہیں کہ جس وقت مہر بندھا تھا اس وقت قیمت مثلاً دس ہزار تھی اور اس وقت قیمت مثلاً پچاس ہزار ہے تو کون سی قیمت دینی ہوگی اور جب ان کو کہا جائے کہ موجودہ قیمت کی تو ماتھے پر شکن اور زبان پر حرف کیوں آتا ہے اور یوں گویا ہوتے ہیں کہ صاحب یہ تو انصاف کے خلاف اور ظلم ہے، تو صاحب یہ ظلم اس لیے نظر آرہا ہے کہ ہم مہر کی شرعی حیثیت کو نہیں سمجھا، مہر دراصل عورت کا شوہر کے ذمہ قرض ہے، اور قرض میں اسی چیز کا لوٹانا واجب ہوتا ہے جو چیز لی جائے چنانچہ قانون شریعت بھی یہی کہتا ہے "الدیون تقضی بامثالھا" اور قانون دنیا بھی یہی کہتا ہے مثلاً اگر دس سال قبل آپ نے کسی کو ایک تولہ سونا قرض دیا اس وقت سونا پانچ ہزار روپے تولہ تھا اب اگر آج آپ کو سونے کے بدلے پانچ ہزار روپے دے تو کیا آپ اسے لے لیں گے، ہرگز نہیں! بلکہ یا تو سونے کا مطالبہ کریں گے یا آج کی قیمت کا۔ تو اس طرح یہ قانون مہر میں بھی چلے گا کچھ جتنی چاندی مقرر ہوئی تھی یا تو وہ دو، اور اگر قیمت دینا ہے تو آج کی قیمت دو، یہ تو عین انصاف ہے۔

مہر شرع محمدی: مہر شرع محمدی، شریعت کی کوئی اصطلاح نہیں، جو مہر طے ہو جائے وہ شرع محمدی کہلائے گا، کیونکہ مہر کی کوئی مقدار شریعت نے متعین نہیں کی ہے، البتہ یہ عرف بن گیا ہے، عوام میں علاقوں کے اعتبار سے بھی اس عرف میں فرق ہے، بعض علاقوں میں تو اس سے مراد اقل مہر ہوتا ہے، یعنی مہر کی جو کم سے کم جو مقدار ہے (۳ تولہ ۶۱۸ ملی گرام چاندی) اور اکثر علاقوں میں اس سے مراد مہر فاطمی ہوتا ہے، تو اگر کسی نکاح میں بطور مہر صرف مہر شرع محمدی کا تذکرہ ہو تو اس علاقہ کے عرف کے اعتبار سے اقل مہر یا مہر فاطمی ادا کرنا لازم ہوگا۔

مہر معجل یا مؤجل: معجل اس مہر کو کہتے ہیں جس کی ادائیگی نکاح ہوتے ہی شوہر پر لازم ہو جاتی ہے عورت جب چاہے اس کا مطالبہ کر سکتی ہے شوہر کا فرض ہے کہ بغیر مطالبہ کے جتنی جلدی ہو اس کو ادا کر دے، اور مہر مؤجل اس کو کہتے ہیں کہ ادائیگی کی کوئی تاریخ متعین کر لی جائے، اس متعینہ تاریخ سے قبل نہ شوہر پر اس کی ادائیگی لازم ہے اور نہ عورت مطالبہ کر سکتی ہے، عموماً ہمارے یہاں کوئی تاریخ متعین نہیں کی جاتی اور مؤجل کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب کبھی نکاح ختم ہو جائے (طلاق یا موت کی وجہ سے) اس وقت ادائیگی ضروری ہے اس سے پہلے نہیں لیکن یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ مہر ایک قرض ہے اور قرض جتنی جلدی ادا کر دیا جائے بہتر ہے، دوسرے کا مقروض رہنا شرعاً پسندیدہ نہیں۔

پسندیدہ مہر: مہر کے بارے میں پسندیدہ اور مسنون یہ ہے کہ نہ اتنا کم ہو کہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہ رہے، اور نہ اتنا زیادہ ہو کہ شوہر اس کی ادائیگی سے قاصر رہے، حضور ﷺ کے زمانے میں پانچ سو درہم (مہر فاطمی) ایک مناسب اور متوسط مہر تھا، آج کے اس دور میں بھی مہر فاطمی کا خیال رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ اس میں اتباع سنت ہے۔

ایک تنبیہ: مہر نہ اتنا کم ہو کہ عورت کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے، اور نہ اتنا زیادہ ہو کہ شوہر اس کی ادائیگی کا خیال بھی دل سے نکال دے، اور پھر عذاب الٰہی کا شکار ہو جائے کیونکہ ایک حدیث پاک میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا اور مہر ادا کرنے کا اس کا ارادہ نہیں تو قیامت کے دن وہ اللہ کے حضور میں زنا کار کی حیثیت سے پیش ہوگا، گرچہ حدیث پاک میں کم یا زیادہ کی تصریح نہیں ہے لیکن عمومی طور پر ایسی نیت حیثیت سے زیادہ مہر ہونے پر ہوتی ہے۔

مہر کی معافی: مہر عورت کا خالص حق ہے، وہ اس کو بالکل بھی معاف کر سکتی ہے اور متعینہ مقدار میں کمی بھی کر سکتی ہے یعنی مکمل بااختیار ہے لیکن معافی کے لیے رضامندی اور خوش دلی شرط ہے۔

آج کل لوگوں کی عمومی حالت یہ ہے پہلی ہی رات میں اس مجبور و بے بس عورت سے زبردستی دباؤ بنا کر معافی مہر کا اقرار کرا لیتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں کہ مہر تو معاف ہو گیا، یاد رکھیے! اس طور پر مہر ہرگز معاف نہیں ہوگا، معافی کے لیے دلی رضامندی شرط ہے، نیز یہ معاف کرانا بے غیرتی بھی تو ہے، گویا ہم اس ضعیف و ناتواں سے بھیک مانگ رہے ہیں، لوگوں کے سامنے تو اپنی جواں مردی اور بہادری دکھاتے ہیں، اور اس کمزور و ناتواں کے سامنے اپنی مردانگی کا چولا اتار کر اپنی کمزوری کا ثبوت دیتے ہیں۔

بقیہ: اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش (اداریہ)

اہل مغرب کو جب مذہبی اور ثقافتی طور پر خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی اور ان کے سبھی ہتھکنڈوں ناکام ہوتے دکھائی دینے لگے، بلکہ خود مغرب کے بعض باحیثیت افراد نے اسلام کی آغوش میں پناہ لے لی تو مغربی وصہیونی مفکرین کو غصہ پھٹ پڑا اور انھوں نے مسلمانوں کے خلاف زمینی جارحیت شروع کردی جس کا آغاز خلیج فارس میں فوج کی تعیناتی سے ہوا، پھر عراق اور افغانستان نے مغربی اقتدار کے عذاب جھیلے، پھر انڈونیشیا میں بالی اور اسپین میں میڈرڈ بم دھماکے کروا کر ایشیا اور یورپ میں مسلمانوں کے گرد گھیرا تنگ کیا جانے لگا۔

2005ء میں Toney Blankley نام کے ایک انتہا پسند صہیونی نے The West's Last Chance نام کی کتاب لکھی جس میں اس نے اس بات پر زور دیا کہ اسلام مغربی تہذیب کا خاتمہ چاہتا ہے، اور اسے ہر حال میں روکنا ہوگا، تہذیبوں کے اس تصادم میں اہل مغرب کے پاس یہ آخری موقع ہے، اور اسلام کی پیش رفت پر یہیں روک لگانا ضروری ہے ورنہ کچھ ہی عرصہ میں یورپ میں اسلام پسند اکثریت میں آجائیں گے اور پھر مغربی اقدار کو بچانا ناممکن ہوجائے گا۔ اس نظریہ کو اتنی شدت کے ساتھ پیش کیا گیا کہ مغرب کی ایک بہت بڑی تعداد اسلام اور اس کی کی بڑھتی مقبولیت سے خوف محسوس کرنے لگی اور اہل اسلام سے انھیں ایک موہوم سا خوف محسوس ہونے لگے جسے خود انھوں نے اسلاموفوبیا (Islamophobia) سے تعبیر کیا ہے۔

آج یورپ سے اسلامی تہذیب کا خاتمہ مغرب کی اولین ترجیح بن چکا ہے، لیکن مسلمانوں کے انخلاء سے یورپ اور امریکہ میں لیبر پاور (Labour Power) کا ختم ہونا بھی یقینی ہے، چنانچہ یہ پالیسی وضع کی گئی کہ مسلمان یورپ میں رہیں لیکن اسلامی تہذیب کو یہاں سے جانا ہوگا، اس کے لیے یہ حکمت عملی اختیار کی گئی کہ راسخ العقیدہ مسلمانوں (خاص کر جنکی ظاہری وضع قطع اسلامی ہو) کے یورپ میں داخلہ پر پابندی عائد کردی جائے، اس کے لیے ویزے کے قوانین سخت کیے گئے، اسکریننگ مشین اور دہشت گردی کے شبہات کو ذریعہ بنا کر رکاوٹیں شروع کی جانے لگیں، پہلے سے موجود اسلام پسندوں کو بے بنیاد معاملات میں پھنسا کر اور کبھی جبریہ جیلوں میں ڈالا جانے لگا، برطانیہ میں پرہیزگار مسلم طلبہ کے سامنے مختلف مشکلات کھڑی جانے لگیں، اور پھر خاص کر فرانس میں حجاب اور دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں کو ہراساں کیا جانے لگا، اس کے علاوہ برطانیہ میں Prevent Campaign کے نام سے ایک بھی مہم شروع کی گئی جس کے تحت مسلم نوجوانوں کی جاسوسی کی جاتی ہے اور انھیں عیسائیت سے قریب کرنے کے جتن کیے جاتے ہیں، اس مہم کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ ہمارا مقصد مسلم نوجوانوں کو اسلام کی انتہا پسند تعلیمات سے روکنا ہے۔

ایک طرف عالمی سطح پر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اور اور اس کو عالم انسانی کے خلاف ایک خطرہ بتایا جارہا ہے اور دوسری طرف اسلام کی بڑھتی مقبولیت سے ہر پڑھا لکھا طبقہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ حقائق کو چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے، اور یہی ان کی اسلام سے نزدیک کا سبب بھی بنتا ہے۔

مغربی مفکرین کو اس بات کا یقین ہے کہ صرف اسلام ہی مذہبی وثقافتی طور پر عالمی قیادت کرسکتا ہے، اور یہودیت وعیسائیت اس کی آفاقیت اور ابدی تعلیمات کے سامنے خس وخاشاک سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب خود اہل اسلام کو اس کا احساس ہو اور وہ مذہبی اور اخلاقی طور پر اس عالمی قیادت کے لیے تیار ہوں، ورنہ اسلامی تعلیمات کی حیثیت محض بہترین نظریات سے زیادہ کچھ نہیں۔

ادارتی نوٹ

محترم قارئین کرام!

پیام عرفات ایک علمی وفکری رسالہ ہے جو کہ مسلسل پانچ سالوں سے پابندی سے شائع ہورہا ہے، یقیناً اس کی اشاعت میں سب سے بڑا حصہ آپ ہی کا ہے، لیکن ہمارے قارئین کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی جن کا سالانہ زرتعاون کسی وجہ سے ہم تک نہیں پہنچ سکا، ہماری آپ سے گذارش ہے کہ اپنا سالانہ زرتعان جلد ارسال فرمادیں تاکہ ادارہ مالی خسارہ سے بچ سکے۔ زرتعاون موصول نہ ہونے کی صورت میں کا اگلہ شمارہ آپ کے نام ارسال نہیں کیا جاسکے گا۔

دفتری امور کے لیے رابطہ کا نمبر:

9918385097, 8604566101

افادات

حضرت حسن بصریؒ

☆مال کی کثرت سے معصیت میں اضافہ ہوتا ہے، اور زیادہ بولنے سے گناہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

☆آدمی کے تواضع کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ ہر شخص کو بہتر سمجھے۔

☆گناہ کے بعد سچی توبہ سے قربت الٰہی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

☆دل کو ذکر الٰہی اور فکر آخرت میں مشغول رکھنے سے دل کی سختی دور ہوتی ہے۔

☆شیطانی وسوسوں کو دور کرنے کے لیے اللہ کا ذکر اور تلاوت قرآن بہترین چیز ہے۔

☆مال و دولت کو عزت دینے والا خدا کے یہاں ذلیل ہوتا ہے۔

☆عقلمند کی زبان اس کے قلب کے پیچھے ہوتی ہے، ہر بات سے پہلے وہ اس سے رجوع کر لیتا ہے، اور جاہل کا دل اس کی زبان کے نوک پر ہوتا ہے، جو بغیر سوچے سمجھے بول دیتا ہے۔

☆دنیا کی مثال سواری کی طرح ہے، اگر اس پر تم نے سواری کی تو وہ تم کو اوپر اٹھائے گی اور اگر تم نے اس کو اپنے اوپر سوار کر لیا تو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

☆نیک آدمی سے دوستی رکھنا گویا خدا سے دوستی رکھنا ہے کیونکہ اس کو دیکھ کر اللہ یاد آئے گا۔

☆دنیا کے طلب گار کو آخرت نہیں ملتی، اور آخرت کے طلب گار کو دنیا بھی ملتی ہے۔

☆مسلمان وہ ہے جو اپنے دل کو خدا کے حوالے کر دے، اور کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔

☆اگر انسان کو اپنی موت کا استحضار رہے تو وہ غیر ضروری کاموں میں نہ پڑے۔

☆حرص و ہوس بری بلا ہے، اس سے اگر کسی چیز میں اضافہ ہوتا تو انسان سب سے پہلے اپنی عمر کو بڑھانا چاہتا۔

☆بگڑے ہوئے حالات تلوار سے نہیں، توبہ سے بدلتے ہیں۔

☆انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے جو شہرت طلبی و ریاکاری کے فریب میں اس کو برباد کر دیتا ہے۔

☆مومن کی ہنسی دل کی غفلت کا نتیجہ ہے، زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہوتا ہے۔

☆مصیبت وہ نہیں جو آئے اور ٹل جائے، مصیبت وہ ہے جو قیامت تک انسان کے سر سے نہ ٹلے۔

☆لوگوں کی تباہی میں بڑا سبب امیدوں اور خیالی منصوبوں کا بھی ہے۔

☆مومن کی شان یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں مضبوط اور صاحب ایمان و یقین ہو۔

☆دولت آنے پر اعتدال کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

☆مومن وہ ہے جو کسی سے نفرت میں اس کی حق تلفی نہ کرے، اور محبت میں حدود سے تجاوز نہ کرے۔

☆اُس ایمان سے کوئی فائدہ نہیں جو یقین سے خالی ہو۔

☆جو دنیا میں اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے، قیامت کے روز اس کو حساب و کتاب میں آسانی ہوگی۔

☆ایک شخص کی عداوت کے بدلہ میں ہزار لوگوں کی دوستی بھی اچھی نہیں۔

انتخاب:-محمد ارمغان ندوی

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Postal Reg. No.
RBL/NP - 09

VOLUME
05

November 2013

ISSUE
No.11

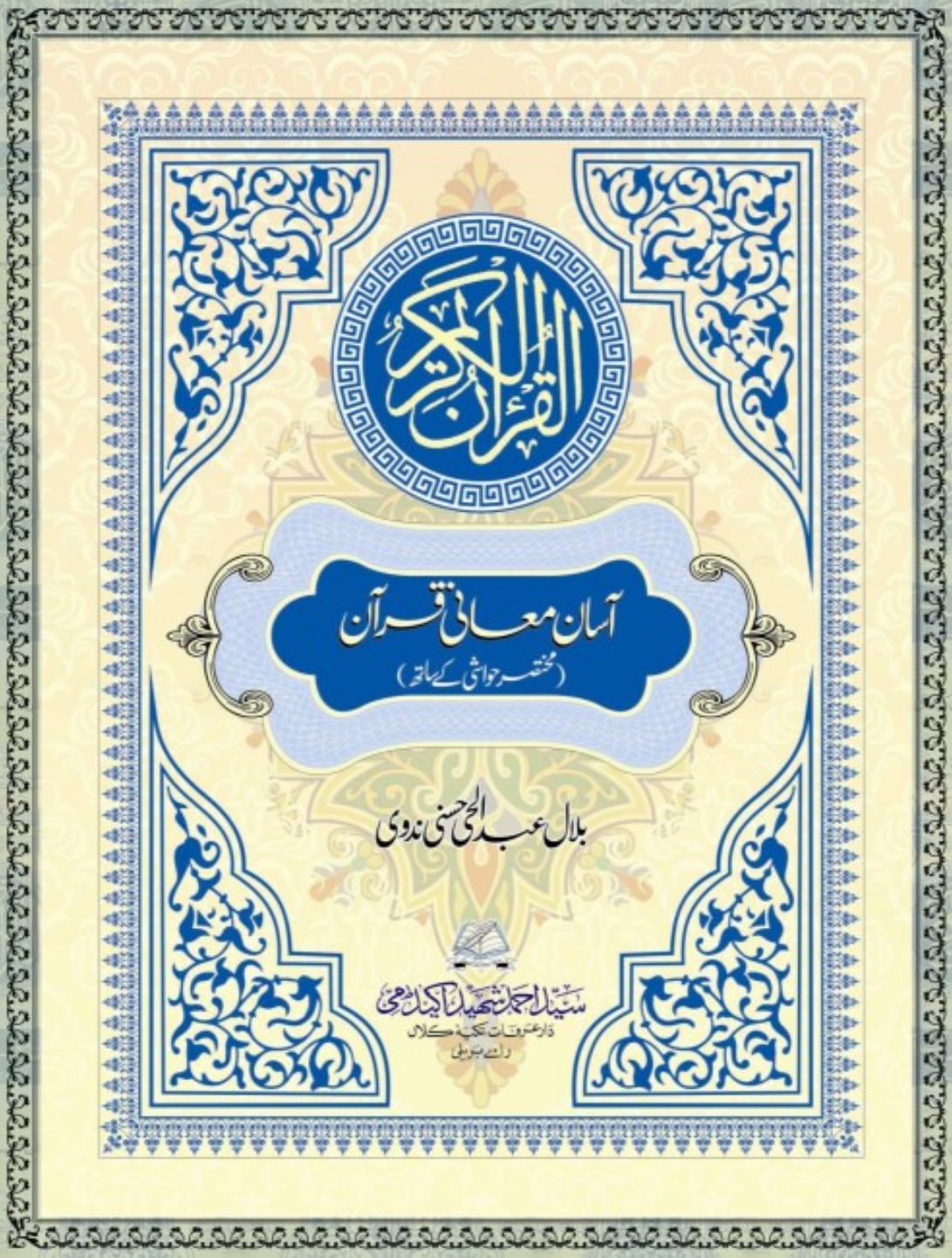

Sayyid Ahmad Shaheed Academy (Contact: 9919331295) www.abulhasanalinadwi.org

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9918385097
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)